کہانیاں دُنیا کی

سلمیٰ اعوان

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد۔لاہور۔کراچی

ترتیب

میں نے اُس سے پیار نہیں عشق کیا۔ گہرا اور کوڑا عشق۔ پر وہ تو زِ گیست کا مارا ہوا نکلا۔ دیکھتا ہی نہیں تھا میں کہیں ہوں بھی۔ یونہی ہلکان ہونے کا احساس ہوا۔ پھر سودا اُوپر والے سے طے کر لیا اور جیسے شانت ہو گئی۔ پر ہوا کیا؟ جب اُس کے بالوں میں چاندی جھلکی اور اعضاء پھُولے تو میری کھوج ہوئی۔ میں کہاں تھی؟ بظاہر اُس کے پاس پر بُہت دور۔

وہ اِک تارا۔

''بس کرو اپنا۔ رُک جاؤ۔ خدا کے لئے رُک جاؤ۔ دُشمنوں اور مخالفوں کے ڈھیر لگا لئے ہیں ہم لوگوں نے۔ اس درجہ ننگی سچائی کو ہضم کرنا ہمارے خودغرض اور مفاد پرست لیڈروں کے لئے بہت مشکل ہے۔

ہزاروں میل دُور سے آتی اِس آواز میں محبت بھری تلخی کے ساتھ ساتھ دُکھ اور ملال کی بھی آمیزش تھی۔

وہ ہنسی تھی۔ پل بھر کی چھوٹی سی ہنسی جسے اُس ہیثم آ گالیف نے ہمیشہ کی طرح یوں ہی محسوس کیا تھا۔ جیسے Baglama بگلما کی تاروں سے بھرپور زندگی میں گندھے ہوئے، دل میں ہلچل مچانے والے، خوبصورت احساس کا سُر ابھی فضا میں بکھرا ہی ہو کہ ختم بھی ہو جائے۔

وہ اُس کی ہنسی کا کتنا دیوانہ تھا۔ جان بُوجھ کر اُسے ہنساتا اور پھر کہتا تمہاری ہنسی مجھے میرے بچپن میں لے جاتی ہے۔ اُن دنوں میں جب میرا دادا سردیوں کی لمبی راتوں میں آگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے Baglama پر اناطولیہ Anatolia کے قدیم گیت گاتا۔ پتہ نہیں اُس موسیقی اور تمہاری ہنسی میں کیا چیز مشترک ہے؟ میں یہ کبھی سمجھ نہیں پایا۔

''اینا آج تمہاری برتھ ڈے ہے اور میں کئی دنوں سے چاہ رہا تھا کہ تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا پر ابھی تھوڑی دیر پہلے انٹرنیٹ پر تمہارا رمضان کیدروف Ramzan Kadyrov پر تیر بر سا تا مضمون پڑھ کر میرے حواس گم ہوگئے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب تمہاری تمنا گولی سے مرنے کی ہے کہ دُنیا میں ڈنکا بج جائے کہ رُوس کی بہادر ترین اور بہترین جرنلسٹ حق سچ پر قربان ہوگئی ہے۔''

اُس کے روم روم میں ایک لطیف سی سرشاری دوڑ رہی تھی۔ پیار، فکرمندی اور ڈانٹ ڈپٹ میں گُھلا ہوا اُس کا انداز ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔

''ھیثم آگالیف اتنے ظالم مت بنو۔''

''تو اور کیا کروں؟ کیسے تمہیں سمجھاؤں؟ ہر اہم غلط مُلکی فیصلے پر تمہارے ایک مضمون کی لگائی ہوئی آگ ابھی مدھم نہیں پڑتی ہے کہ تم ایک اور دھماکہ کر دیتی ہو۔ چندلمحوں کیلئے وہ خاموش ہوگیا تھا۔ سچ کی تلخی سے بھری ہوئی یہ گولیاں وہ اُسے محبت کے میٹھے میں لپیٹ کر دیتا تھا۔

اینا ایک بات بتاؤ مجھے۔ اینڈری کوزلوف کے قتل کا سراغ ملا نہیں۔ کبھی ملے گا بھی نہیں۔ سنٹرل بینک کی مالی بے ضابطگیوں میں حکومتی مگر مچھ ملوث تھے اور وہ اس فراڈ کو بے نقاب کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اب پیوٹن کا وہ نمبر ون بدترین مخالف آئل کا ٹاپ بزنس مین

میخائل خودور کوسکائے کی گمشدگی کا عنوان تمہارے ہاتھ آ گیا ہے۔گھائل ہو رہی ہو۔ ہڑتالیں اور جلوس نکل رہے ہیں۔ہونا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔چند دن کے شوروغوغا کے بعد سب بیٹھ جائیں گے۔یہی ہونا ہے۔جمہوریت کے علمبردار رہبر بڑے اور چھوٹے مُلک میں یہی کچھ ہورہا ہے۔

''مجھےتو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔مجھےتو اپنے حصّے کی شمع جلانی ہے۔اندھیرا کتنا کم ہوتا ہے، وہ سوچنا میرا کام نہیں۔''

اُسے محسوس ہوا تھا جیسے اُس کا لہجہ بوجھل سا ہوگیا ہے۔نمناک سا۔

اوراُس ھیثم آ گالیف سے تو یہ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔

''اچھا چھوڑو۔چلو کینڈل جلاؤ۔سامنے کیک رکھو۔اسے کاٹو۔میں ہیپی برتھ ڈے گاتا ہوں۔پھر میں Live Long گاؤں گا۔

''کیا کرتے ہوتم؟ مجھے یہ سب کرنا مشکل لگتا ہے۔تم سے زیادہ مجھے کون سمجھتا ہے؟''

''اپنا پتھر مت بنتی جاؤ۔جو میں کہتا ہوں کرو۔کہیں تو چند لمحوں کے لئے زندگی کی خوبصورتیوں اور رعنائیوں پرتمہاری آنکھ کو جمنا چاہیے۔دیکھو میں کینڈل جلا رہا ہوں۔کیک میرے پاس پڑا ہے۔اِس پرتمہارا نام ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں شبنم سی اُتری۔آواز میں بھی بھرّاہٹ سی اُبھری۔

''کتنا مشکل ہوگیا ہے خود پرضبط کرنا۔'' اُس نے جیسے خود سے یہ کہا تھا۔

''ھیثم ذرا ٹھہرو۔میں چیزیں سیٹ کرلوں۔''

اپنے بھیگتے جذبات، اپنی بے چینی اور اضطراب پر قابو پانے کے لئے یہ بہانہ کتنا کارگر تھا۔

اُن کے درمیان رابطے کا بڑا ذریعہ تو انٹرنیٹ تھا جہاں ویب کیم کے ذریعے بُہت سی خواہشات کی سیری ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی ایک دوسرے میں اتنے مست ہو جاتے کہ یوں محسوس کرتے جیسے پاس پاس بیٹھے ہوں۔ ہیثـــــم اُس کے کھانے پینے سے لے کر پہناوے تک میں مداخلت کرتا۔

پر کل شام سے اُس کے انٹرنیٹ میں کچھ خرابی تھی۔

''چلو اچھا ہی ہوا۔ کپڑوں سے لے کر کیک تک اور موم بتی ماچس تک تو باز پُرس ہوئی تھی۔'' جیسے ابھی وہ پُوچھتا اور کہتا تھا۔

''مجھ سے کچھ نہیں ہوا۔ میں بُہت اُداس ہوں۔ تمہاری جُدائی نے مجھے بُہت زود رنج بنا دیا ہے۔ میں کس قدر حساس ہو گئی ہوں۔ وگرنہ تو ہمیشہ ہی منہ پھاڑ کر کہہ دیا کرتی تھی۔

چلو چھوڑو ھیثم۔ بڑے چونچلے۔ کوئی کام کی بات کریں۔''

یہ سب گویا اُس نے اپنے آپ کو سُناتے ہوئے کہا تھا۔

اور پھر وہاں جھوٹ تھے۔

''میں نے وہی لونگ سکرٹ پہنا ہے۔ ارے بھئی وہی والا جو تم میرے لئے جارجیا سے لائے تھے۔ ہاں ھیثم اِس کے ساتھ بلاؤز پھولوں والا ہے۔ میں نے بریسلیٹ اور انگوٹھیاں بھی پہن رکھی ہیں۔ کافی کا مگ میں نے بائیں ہاتھ رکھ لیا ہے۔ ہاں ہاں میں بھولی نہیں چھری میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ کیک سامنے پڑا ہے۔ شمع جل رہی ہے۔ لو میں نے کیک کاٹ دیا ہے۔''

تالی کی آواز۔ ہپی برتھ ڈے۔ ہپی برتھ ڈے ٹو مائی سویٹ اینا۔

ٹپ ٹپ کتنے ڈھیر سارے آنسو اُس اُدھڑے پُدھڑے بدرنگے سے کارڈیگن

کے دامن پر گرے تھے۔ جو وہ کل شام سے پہنے ہوئے تھی۔ پینٹ کوئی تین دنوں سے ایک ہی چل رہی تھی۔

پھر اچھے دنوں کی ایک نوید بڑے میٹھے سُروں میں اُس کے کانوں میں اُترنے لگی تھی۔ وہ ولادی میر مایا کوفسکی کو گا رہا تھا۔

وہ شاعری کا ہمیشہ سے رَسیا تھا۔ اُس کی آواز بھی خوبصورت تھی۔ اُس کی گفتگو اکثر و بیشتر کسی شاعر کے خوبصورت شعروں پر ختم ہوتی۔ بُہت دھیان اور توجہ سے منتخب کردہ یہ اشعار اُمید کا پیغام دیتے دیتے رُوح کو بھی اِس میں بھگو دیتے تھے۔ شاعری سے اپنا کا لگاؤ، اِس ذوق میں نکھار اور گہرائی اُسے ہشم کی قُربت نے دی تھی۔

ریسیور واپس رکھتے ہوئے پُشکن کی ''رات'' آنکھوں کے سامنے تھی۔

اِک اُداس سی شمع
جلتی ہے
میرے اُجڑے ہوئے گھر میں
بجھی بجھی سی اس کی کرنیں
اندھیرا اور بھی بڑھاتی ہیں

(ظ انصاری)

اور اُس وقت جب ماسکو کی کیرماوٹسکایا Karmavitsky سٹریٹ کے ایک فلیٹ اور انگلینڈ کے چیسٹر فیلڈ کے مابین کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک ہونے والی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوئے بھی خاصی دیر ہو چکی تھی وہ ابھی تک کُرسی میں دھنسی خود کو ڈھیلا چھوڑے

ہوئے کہیں دُور منظروں میں گُم تھی۔ وہ منظر جو اِن بوجھل دنوں میں اُس کے لئے اُمید اور سکون کا باعث تھے۔

جب وہ ایسا کرتی تھی نہیں جانتی تھی کہ رات کے اِس دوسرے پہر فراٹے بھرتی ایک جیپ مضافات سے اولڈ ماسکو میں داخل ہو رہی تھی۔ نیو ارباط کی کشادہ شاہراہ سے نووِنسکایا پر ٹرن لیتے ہوئے اُس کی تیز رفتاری میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ پر وزاراتِ خارجہ کی شاندار جاہ وجلال والی عمارت کے سامنے سے گذرتے اور سمولنسکایا چوک تک آتے ہوئے رفتار آہستہ ہوگئی تھی۔

ڈرائیو کرتے ہوئے سارجنٹ نے اک ذرا رُخ پھیر کر ساتھ بیٹھے سکیورٹی آفیسر کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا تھا۔

''دائیں ہاتھ ذرا آگے Beljard ہوٹل ہے۔ وہاں سے بائیں طرف مڑنا۔ چرچ کے پاس رُک جانا۔''

ماسکو کی راتیں یُورپ کے شہروں کی طرح جوان رہنے لگی ہیں۔ اولڈ ارباط سٹریٹ سے سیاحوں کے پرّے مختلف ملحقہ سڑکوں پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔

جیپ رُک جانے پر تیس بتیس سال کی عمر کا نوجوان اُترا اور سامنے چلتے ہوئے ایک تین منزلہ فلیٹ کو بغور دیکھنے لگا۔ حافظے نے کہا تھا۔ ٹھیک پہنچے ہو۔

دوسری منزل پر رُکنا پڑا تھا۔ غربی سمت کے گہرے براؤن رنگ کے بند دروازے پر لگی نیم پلیٹ پر لکھے گئے دو نام ہیشم آگ الیف اور اینا پولٹکوسکایا Anna Politkovskaya بڑے نمایاں نظر آئے تھے۔ اُس نے فوراً بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ اتنی جلدی اُسے انٹرکوم پر جواب کی توقع نہیں تھی۔ مُدّعا بتایا اور بس چند لمحوں بعد دُبلا پتلا ایک وجود یوں باہر نکل آیا جیسے وہ منتظر ہی بیٹھا ہو۔

یہ کیسا چہرہ تھا۔متین سا،نرمی کی پھوار میں بھیگا بھیگا چہرہ جس کے نقوش میں کہیں سختی نہیں تھی۔آنکھوں کے نیچے سُرخی مائل حلقے تھے۔آنکھیں چمکدار،ذہانت اور دلیری کی روشنی سے جیسے جگمگاتی سی بوائے کٹ براؤن شیڈ دیتے رُوکھے رُوکھے بکھرے بال۔رائل بلیو پینٹ پر آف وائٹ موٹا ڈھیلا بے سرا سا پُرانا کارڈیگن۔

اور جب وہ اُس کے کاغذات چیک کرتی تھی۔سکیورٹی آفیسر نے اپنے دل میں کہا تھا۔

تو یہ ہے وہ دھان پان سی پونے چھ فٹی عورت۔چیچنیا کے لوگوں کی خیر خواہ۔پیوٹن اور اُس کی پالیسیوں کی بدترین ناقد۔

اُس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی وہ آکر جیپ کے پچھلے حصّے میں بیٹھ گئی جو چاروں طرف سے بند تھی۔

اُس وقت اُسے احساس ہوا تھا کہ اُس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔میخائل خودورکوسکائے Khodorkovsky کی گمشدگی پر مضمون لکھنے میں ایسی جُتی تھی کہ سلسلہ اُس وقت ٹوٹا تھا جب ھیشم کی انگلینڈ سے کال آئی۔حالانکہ آج صبح اُس نے اُسے یاد دلایا تھا۔

''اینا تمہاری برتھ ڈے ہے آج۔یاد رکھنا۔''

وہ پھر بھی بھول بیٹھی تھی۔اپنی ذات سے متعلق ہر بات وہ ہمیشہ سے نظر انداز کرنے اور بھولنے کی عادی تھی۔

اور اب سوچتی تھی کہ کیا تھا اگر وہ اُس کی بات مان لیتی۔اِس وقت معدہ کتنا خالی خالی سا محسوس ہوتا ہے اور کافی کی طلب کتنی بڑھ گئی ہے؟

جیپ ڈھلانی راستوں کے پیچ و خم سے گذرتی ہوئی ایف ایس بی سکیورٹی سروس

کی دُنیا میں داخل ہوگئی جو کبھی "کے جی بی" کے نام سے جانی جاتی تھی۔اب نام بدل گیا تھا۔تب آج کی نسبت مار دھاڑ زیادہ تھی۔حربے تو آج بھی وہیں ہیں بس ذرا انداز بدل گئے ہیں۔

ڈرائیور نے دروازہ کھول کر کسی قدر رعونت سے اُسے باہر آنے کا کہا۔سکیورٹی آفیسر اُسے عمارت کے مختلف حصّوں سے گذارتا ہوا جہاں لے کر آیا، یہ سٹیل اور سیمنٹ کے ملاپ سے بنے ہوئے عالیشان بلاک کا ایک حصّہ تھا جہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک بڑی میز کے گرد کُرسیوں پر چھ لوگ بیٹھے تھے۔

کمرے میں قبرستان جیسی خاموشی تھی۔چھ کے ٹولے میں سے صرف دو نے نیم ایستادہ ہو کر اُسے احترام دیتے ہوئے اُس کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ساتویں اور غالباً اُس کے انتظار میں تھی۔بڑی تیکھی اور نوکیلی نظریں تھیں، جنہوں نے بار بار اُٹھ اُٹھ کر اُسے دیکھا تھا۔میز پر دیگر چیزوں کے ساتھ اُس کی تینوں کتابیں Putin's Russia، "A dirty war " اور " Life In a Failing Democracy" کے ساتھ ایک موٹی فائل بھی پڑی تھی۔

''اِس فائل میں یقیناً میرے نوایا Novaya Gazeta میں لکھے جانے والے مضامین ہوں گے۔اُس نے سوچا تھا۔''

اندر داخل ہونے اور بیٹھنے تک کے مرحلے میں اُس نے برقی انداز میں ایک ایک چہرے کو پل پل اُن پر رکتے ہوئے دیکھ ڈالا تھا۔داہنے ہاتھ دوسرے نمبر پر بیٹھے ہوئے جس افسر نے سوال کیا تھا اُس کا چہرہ ہی کرخت نہ تھا، لہجہ بھی پورپور حقارت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''چیچنیا کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ہمدردی کے پس منظر میں چیچن مسلمان سے محبت اور اس سے شادی نہیں ہے کیا؟''

سوال کرنے والا کتنے پانی میں ہے؟ اس پر پہلے ہی ہلّے میں ظاہر ہو گیا تھا۔
اُس کی نظروں میں ٹھہراؤ تھا۔ گہرائی تھی۔ جیسے کسی لبالب بھرے پُرسکون سے تالاب میں کوئی جاہل پتھر مار کر سمجھے کہ اُس نے پانیوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔

''پہلی بات میں نے کسی مسلمان سے نہیں انسان سے محبت اور شادی کی ہے اور یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ دوسرے گزشتہ چھ سالوں میں جتنے چوٹی کے جرنلسٹ قتل کئے گئے یا جیلوں میں سڑ رہے ہیں نہ وہ خود مسلمان ہیں اور نہ اُن میں سے کسی نے بھی کسی مسلمان سے شادی کی۔ سچائی اُن کا جرم تھا۔

دفعتاً ڈائریکٹر جنرل کے موبائل کی بیپ سنائی دی۔ دوسری جانب سے استفسار یقیناً اُسی کے بارے میں تھا۔ گفتگو کوڈ الفاظ میں تھی۔ ڈی جی کے چہرے پر بکھرے تاثرات اُس جیسی زمانہ شناس عورت نہ سمجھتی بھلا کہیں ممکن تھا۔ گفتگو کا سلسلہ جب دوبارہ شروع ہوا۔ اُس کا لہجہ نہ صرف حتمی تھا بلکہ اُس میں سختی بھی تھی۔

آزادی چیچنیا کے لوگوں کا حق ہے۔ تیل کے ذخائر اُن کی ملکیت ہیں۔ رُوس تو بڑے اوچھے ہتھکنڈوں پر اُترا ہوا ہے۔ کسی بھی لڑائی کو جیتنے کے لئے کوئی اخلاقی جواز ہوتا ہے۔ یہاں سرے سے ہی کچھ نہیں۔ مظلوم اور محکوم کیمونٹی وہ خواہ کوئی بھی ہو اُسکی سپورٹ اخلاقی فریضہ ہے۔''

ڈائریکٹر جنرل یوری پچرکا نے قدرے رسان سے کہا۔

''آپ رُوسی مفادات کے خلاف مت جائیے۔ رُوس کی ایک بہادر ترین اور بہترین جرنلسٹ کی حیثیت سے مجھے آپ کا بہت احترام ہے۔ مگر ہماری مجبوریوں کا کچھ خیال کیجیئے۔ ہم پر حکومت کا شدید دباؤ ہے۔''

وہ خفیف سا ہنسی۔

''کسی بھی پولیس کے لئے جرائم سے چشم پوشی کرنا گویا جرائم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔''

''تم تو خود ڈاکواور لٹیروں کی اولاد ہو۔تمہارے آباء ''کوساک'' تھے نا۔

تیسرے نمبر پر بیٹھنے والے کا لہجہ تُرشی اور نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

بڑا گھٹیا سوال اور تضحیکی رویہ تھا جو اُس کی انا کو کُچلتا ہوا اُسے اُس سُوکھی لکڑی کی طرح چٹخا گیا جو آگ میں ڈالتے ہی بھڑ بھڑ جلنے لگتی ہے۔اُس کے لہجے میں زہر گھُل گیا تھا۔اُس کی آنکھوں سے طنز بھرے تیروں کی بوچھاڑ نکلی جو اُن کے کلیجوں میں ایک طرح پیوست ہوگئی۔

''پڑھا کرو۔ تاریخ سے واقفیت تم لوگوں کے لئے بہت ضروری ہے تا کہ نالائقی ظاہر نہ ہو۔''

''یہ جس ماسکو میں تم بیٹھے بڑھکیں مار رہے ہو یہ میرے آباء کوساکوں کا زاروں کو دان پُن تھا۔جو تا تاریوں کے تلوے چاٹتے تھے۔وہ یہود (خراج) ادا کرتے تھے۔میرے بڑے،زاروں کے ہاتھوں کی وہ کنجیاں تھے کہ جن کے بغیر وہ مشرق کا دروازہ کھولنے کے اہل ہی نہ تھے۔''

اگر ڈائریکٹر جنرل وہاں موجود نہ ہوتا تو یقیناً بقیہ لوگوں نے اُسے کسی ٹارچر سیل میں لے جا کر اُس کی تواضع کرنی تھی اور اُسے یوں پٹر پٹر بولنے کا مزہ چکھانا تھا۔پر ہلکی پھلکی تنبیہہ کے ساتھ اُسے رُخصت کر دیا گیا۔

رات کا تیسرا پہر ختم ہو رہا تھا جب اُس کی واپسی ہوئی۔پہلے جیپ سے اُتر کر اُس نے اِک ذرا رُک کر پہلے آسمان کو دیکھا۔عجیب سی بات تھی۔ماسکو اور پیٹرزبرگ کی سفید

راتوں میں اُسے ہمیشہ ایک عجیب سا فرق محسوس ہوتا۔ وہ ماسکو کی راتوں کو کبھی سفید راتیں نہیں کہتی تھی۔

اُس وقت سیاحوں اور لوگوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ سناٹا اور تنہائی تھی۔ ملگجا اُجالا تھا۔ وہ فلیٹ میں داخل ہوئی۔ کچن میں گئی۔ کافی بنائی۔ چورنی غلیب کے بچے کچھے ٹکڑوں پر مکھن کی تہہ اور کیویئر لگا کر لاؤنج میں آ گئی۔

بالعموم اپنے اُوپر لگنے والے اعتراضات پر وہ تلملایا نہیں کرتی تھی۔ ایسی بپتیاں بھگتنے کی وہ عادی تھی۔ بہت کم اپنے دفاع میں بولتی، پر اِس اتنی گھٹیا بات نے اُسے رنجیدہ کیا تھا۔

بات کہنے کہنے میں کتنا فرق تھا۔ سالوں پہلے ھیشم آ گالیف نے بھی ڈپارٹمنٹ لائبریری کی سیڑھیوں کے پاس یہ بات کہی تھی۔ پر ایک تفاخر بھرے انداز میں۔

''اپنا تمہارے اندر دلیری، جرأت، سچ پر کھڑے ہونا اور غلط بات اور غلط فیصلوں کے خلاف ڈٹ جانے کی خوبیاں تمہارے اَجداد کی نشانیاں ہیں۔ تم کوساکوں کی اولاد ہو نا''

اُس کے لہجے اور انداز میں اُس کے لئے جو فخر، مان اور اعزاز تھا اُس نے اُسے مسرُور کیا تھا۔

اُسے اپنے آباء کو ساکوں پر بہت اعتراضات تھے۔ بیچارے ماسکو کے جاگیرداروں اور نوابوں کے غلام جنہوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ماسکو کو چھوڑ کر سرحدوں کی طرف ہجرت کر لی تھی۔ دشت اُن کے ٹھکانے بن گئے تھے۔ تاتاریوں اور خانہ بدوشوں سے لڑتے، اُنہیں لوٹتے، شکار کھیلتے، دریاؤں کو پار کرنے کے لئے کشتیاں بناتے، اور علاقے فتح کرتے کرتے اُنہوں نے ایک زمانہ اپنے اُوپر گذار دیا۔

پھر جانے کون سے احمق تھے جنہوں نے اُنہیں مشورہ دیا یا اُن کی اپنی کم عقل

کھوپڑیوں میں یہ بات گھس گئی۔

اُنہوں نے فتح کئے علاقے زاروں کو پیش کر کے خود کو اُن کا دست راست بنالیا تھا۔

کوئی اُن عقل کے اندھوں سے پُوچھتا تمہیں وختہ کیا پڑا تھا۔ بازو بیلنے میں آگئے تھے تمہارے۔ پریشانی تھی۔ کوئی تکلیف تھی۔ آخر کیا تھا۔ خود آگے بڑھ سر پر تاج سجانے میں کیا چیز حائل تھی؟

اُلو کے پٹھے زاروں کیلئے ہی مرتے رہے۔ ایک نئے حکمران خاندان کا اضافہ ہو جاتا تاریخ میں۔ آخر حرج ہی کیا تھا۔

اُس کے پردادا نے خانہ بدوشی چھوڑی۔ کچھ عرصہ شمالی کاکیشیا کے سلسلہ ہائے کوہ کی وادی کارچائی Kerch میں جو آزر Azor کا ساحلی شہر تھا میں رہائش کرلی۔

یہاں ہری بھری خوبصورت پہاڑیوں میں نیلے شفاف پانیوں سے لبالب بھری جھیلیں تھیں جن پر مرغابیوں اور چیلوں کی اُڑتی قطاریں تھیں۔ میپل کی جھاڑیوں میں تیز رفتار ندیاں بہتی تھیں۔ گھنے جنگل اور نارنجی آسمان کے نظارے دل موہ لینے والے تھے۔

اُس نے بڑی لمبی سانس بھری تھی۔ کافی کا آخری گھونٹ لے کر مگ تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کارچائی سے نقل مکانی کیوں ہوئی اور دریائے کاما کے بائیں کنارے سولیکمسک شہر (Solikamsk) کے جنوب میں ایک چھوٹی سی بستی اوسولئے میں ڈیرے کیوں ڈالے گئے؟ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ وہ کبھی نہ جان سکی۔ یوں اُس کا قیاس تھا کہ یہاں بُہت بڑے بڑے جنگل تھے۔ جن پر اُس نے قبضہ کرلیا۔ نمک کا نفع بخش کاروبار تھا۔ بہت جلد وہ اِس علاقے کا ایک جاگیردار سا حکمران بن گیا تھا۔ پر اُس کے دادا کی یادداشتوں سے کارچائی کبھی نہ نکل سکا۔ جب بات ہوئی اوسولئے اور کارچائی کا مقابلہ ہوا۔ یہ بھی خوبصورت جگہ تھی

جو اُسے تو بہت پسند تھی۔

وہ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سوچا سو جائے۔ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ پر بغیر کسی ارادے اور سوچ کے بالکونی میں آ گئی۔ دفعتاً اُسے عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے ریڑھ کی ہڈی پر کنکھجورا سا رینگ جائے جو سارے سریر میں سرد اور جھنجھنی لینے والی برقی رو دوڑا دے۔ سر جھٹکا۔

''اُفوہ'' جھلا کر وہ خود سے بولی۔

''دیکھو! باہر فضا ۂت نکھری ہوئی اور روشن ہے۔ صُبح گویا پیغام اُمید ہے۔ ایسے میں اِن بے تکی اور فضول سوچوں کا بھلا کیا کام۔ دراصل نیند بھی تو نہیں لے سکی۔ تھیٹر والے حادثے کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا۔ اُوپر سے ہیشم کا لکچر۔ اُس نے سر جھٹکا اور کمرے میں آ گئی۔

''مالی تھیٹر میں جو کچھ ہوا'' اُس نے جھرجھری لی۔

''وہ دہشت گردی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یقیناً ہے۔ مجھے انکار نہیں۔ مگر ایسا ہوا کیوں؟''

اُس کا یہ سوال اپنے آپ سے تھا۔ اُس کے اندر سے جواب بھی آیا تھا۔

''جب بڑی طاقتیں چھوٹے لوگوں کی آزادی سلب کر لینے کے درپے ہو جائیں تو اُن کے پاس ایسے ہی اُلٹے سیدھے ہتھکنڈے رہ جاتے ہیں۔''

مالی تھیٹر کے مناظر ایک کے بعد ایک آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے تھے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ وہ اُس وقت اولڈ ارباط سٹریٹ میں تھی۔ کچھ کھانے پینے کے لئے آئی تھی۔ آفس سے سیدھی اسی طرف نکل آئی خود سے یہ کہتے ہوئے۔

''چلو اکتوبر کی اِن خوشگوار سی رُتوں میں ڈنر ارباط میں کرتی ہوں۔ ہمسائے میں

رہتی ہوں اور سالہا سال گزر گئے ہیں اِس تاریخی بازار میں جھانکے ہوئے۔''

پر جونہی داخل ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے اِس بے حد خوبصورت روشنیوں، رنگوں، خوشبوؤں اور حُسن و رعنائیوں سے پُر بازار میں کسی نے ہر سو خوف و دہشت کا سپرے کر دیا ہو۔ جن جن دو کانوں میں ٹی وی تھے وہاں لوگوں کے ہجوم کھڑے تھے۔ کھانے کا ارادہ چھوڑ کر وہ واپس گھر بھاگی۔ ٹی وی کھولا اور ساکت ہو گئی تھی۔

ماسکو کے شہری ایک بدترین سانحے کا سامنا کر رہے تھے۔ مالی تھیٹر میں ملٹری میوزیکل شو ہو رہا تھا۔ کوئی ساڑھے سات سو تماشائی تھے جب مشین گنوں سے لیس چیچنیا کے جیالوں کے ایک گروپ نے تھیٹر کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ مطالبہ تو بڑا جائز تھا۔ ماسکو چیچنیا میں جنگ کو بند کرے وگرنہ وہ لوگوں اور تھیٹر کو اُڑا دیں گے۔

صورتِ حال کتنی ہولناک تھی۔ سپیشل فورسز نے تھیٹر کو اعصاب شل کر دینے والی گیس سے بھر دیا۔ ایک کے بعد ایک لاشیں تھیٹر کے دروازے سے نکالی جا رہی تھیں اور عام رُوسی اپنے ٹیلی ویژنوں کے سامنے ساکت بیٹھے چیچنیا کے لوگوں کو لعن طعن کر تے تھے۔ ایک سو اُنتیس لوگ اور اکتالیس چیچن جنگجو مر گئے تھے۔

اب سچی بات لکھنا جُرم بن گیا ہے۔ وہ لیٹ گئی تھی۔ پر نیند تو آنکھوں میں کہیں نہیں تھی۔

کہیں زیادہ دُور بھی نہیں بس قریب ہی ایک منظر اپنے پورے رنگوں کے ساتھ جھلملایا تھا۔ ایک آواز اپنی گھن گرج کے ساتھ سنائی دی تھی۔

''سر گذشتہ پندرہ دنوں سے لائبریری میں پرانے ''پرودا'' کی ورق گردانی کرتے اور اپنے حکمرانوں کے بارے میں رپوٹیں پڑھتے ہوئے میرے تو چودہ طبق روشن

ہو گئے ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیسے کروں؟

کوئی ایک دو نہیں بے شمار آوازیں بلند ہوئی تھیں۔

''کہو کہو جو کہنا چاہتی ہو۔ کھُل کر اظہار کرو۔''

''سر ہمارے حکمران اتنے کرپٹ اتنے لالچی تھے۔اُس اُلّو کے پٹھے برژنیف سے کوئی پُوچھنے والا نہیں تھا کہ کوئی کمی تھی اُسے گاڑیوں کی۔اُس نے کس منہ سے امریکہ سے مونتے کارلو کی بات کی۔اس کا گیراج تو گاڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔ایک سے بڑھ کر ایک عالیشان گاڑی۔رولز رائس،مرسیڈیز،سیڈان،سٹرون اوراس کی نئی نویلی مرسیڈیز ایس ایل 300۔اور وہ بڑا مہان امریکہ اِسے تحفہ دیتا تھااور یہ گاڑی کا نام بتاتا تھا اُنہیں۔پلسز بیئر، مغربی ملبوسات اور قیمتی زیورات تو پراگ سے اُسے بھیجے جاتے تھے۔کتنا بے غیرت تھا۔ اُسے ملکی وقار کا ذرا احساس نہیں تھا۔''

باہر گہری دُھند تھی۔سردی کی انتہا تھی۔کھڑکیوں کے راستے میدان میں نظر آنے والے لنڈ منڈ درخت گہرے اور دُھند کے غلافوں میں لپٹے عجیب سے منظروں کے عکاس تھے۔کلاس روم میں سنہرے بالوں والی پونی ٹیل کولہراتی اٹھارہ اُنیس سالہ ''اوسولئے'' کی اینا انٹرنیشنل آفیسرز کی کلاس میں بے حد جذباتی انداز میں سوال پرسوال کئے جاتی تھی۔

کلاس کی ایک اور لڑکی نے لقمہ دیا۔

''اُس کی بیوی کے پاس فر کے پتہ ہے کتنے کوٹ تھے؟پورے سترہ۔''

پورے سترہ کو جس انداز میں کہا گیا اس پر کلاس میں زوردار قہقہے گونجنے لگے۔

جوزف سٹالن کے دور کی زبان بندی جیسی سختی جھیلنے والا اُستاد کو اب قدرے بہتر فضا میں سانس لیتا تھا مگر وہ رفتہ رفتہ والی بات ضرور تھی۔دلداری کے لفظوں سے بہلاتے ہوئے بولا تھا۔

''سربراہان مملکت کے لئے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہوئے تحائف دینا اور لینا سفارتی ایٹی کیٹس میں شمار ہوتا ہے۔صدر نکسن نے ضرور پوچھا ہوگا۔اب بتا دینے میں حرج کیا تھا؟''

''نہیں سر۔''

پچھلی نشستوں سے ایک چھ فٹا خوبصورت لڑکا اٹھا اور بولنے لگا۔

''آپ نے غالباً نکسن کے دورۂ رُوس کے تاثرات کے بارے میں نہیں پڑھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ امریکہ کا صدر ایک خوشحال زندگی نہیں گذارتا ہوگا۔ یقیناً گذارتا ہوگا۔مگر وہ حیران ہوا۔برژنیف اور ہمارے اعلیٰ بیوروکریٹس کے لیونگ سٹائل دیکھ کر۔''

یہ ھیشم آگالیف تھا۔کاکیشیائی علاقے چیچنیو اینگوش کا۔

کلاس کی فسٹ ٹرم کے دوسرے ماہ کے آخری ہفتے کا تیسرا یا چوتھا دن تھا۔دونوں کے انداز میں دوردراز علاقوں سے تعلق کا دیہاتی پن نمایاں تھا۔مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق آنے والے کل میں کیا رُوپ دھاریں گے کا پتہ چلتا تھا۔کلاس کے خاتمے پر دونوں ایک دوسرے کی طرف مقناطیسی انداز میں بڑھے تھے۔

ماسکو جیسے ترقی یافتہ اجنبی شہر میں ایک دوسرے سے مانوس ہونے میں انہوں نے اپنی تعارفی تقریب کے بعد پل نہیں لگایا تھا کہ درمیان میں دُوری کا علاقائی احساس ہونے کے ساتھ ساتھ سچائی،ظلم و ناانصافی کے لئے ڈٹ جانے کے جذبات بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔

ماسکو کے گلیمر اور اُس کے سحر سے دونوں بہت متاثر تھے۔دونوں بس میں بیٹھ جاتے۔باتیں کرتے جاتے۔دائیں بائیں دیکھتے جاتے،کسی خوبصورت منظر پر فوراً ایک دوسرے کو متوجہ کرتے۔

''دیکھو۔دیکھوذرا۔''

ایسی ہی نشستوں میں انہوں نے ایک دوسرے کے بارے میں جانا تھا۔

ہیثم آ گالیف تُرکوں کے سب سے بڑے خانوادے سلجوق کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو صدیوں پہلے دریائے والگا کے شمالی خطّوں بلغاریہ میں آ آباد ہوئے تھے۔ کوئی ایک صدی پہلے ہیثم کا دادا ایک جلدی بیماری میں مبتلا ہوگیا۔علاج معالجے کے باوجود بیماری بڑھنے لگی تو کسی نے منرالنئے وودی وادی کے شفا بخش چشموں کا ذکر کیا۔طویل سفر کے بعد جائے مطلوبہ پہنچا۔چند دن قیام کیا۔اُس کے حماموں پر غسل کیا۔ شفا محسوس ہوئی۔تب اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہیں سکونت پذیر ہوگا۔

نقل مکانی ہوگئی۔ یہ بہت خوبصورت اور حسین علاقہ تھا۔ یہاں انہوں نے گیہوں، تمباکو اور سبزیاں پیدا کیں۔ ہیثم کا چچا آدیگئی چلا گیا جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ سو میل پر بڑی زرخیز وادی تھی۔دریائے کوبان کے کنارے اُس نے گھوڑوں کے فارم اور پھلوں کے باغات لگوائے۔ ہیثم اپنے چچا کے پاس دنوں کیا مہینوں رہتا۔اُسے گھوڑوں سے خصوصی رغبت تھی۔

گریجوایشن اُس نے Donetsk سے کیا۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ ماسکو آ گیا۔

دونوں جب ماسکو کے گلی کوچوں میں پھرتے۔اُس کی مارکیٹوں میں گھومتے۔ اُس کے محلوں کی سیر کرتے۔اگر یہ جگہ اُن کے لئے ایک پُرتحیر، خوبصورت اور بہت رومانوی سی دُنیا تھی تو وہیں وہ گاہے گاہے اِس پر بھی دُکھ کا اظہار کرتے کہ آخر اُن کے علاقے اِس درجہ ترقی یافتہ کیوں نہیں؟ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اِس ضمن میں جو مسائل اور جو ترجیحات راستے میں حائل ہوتی ہیں۔دونوں اپنی اپنی بحثوں کے دوران اُن میں سے

بُہت سوں پر اتفاق رائے کر لیتے۔

ھیثم کے لئے چند باتوں پر سر ہلانا مشکل ہو جاتا تھا۔چیچنیا کی خودمختاری سے لے کر اُسے اُس کے تیل کے ذخائر پر رُوس کے جبراً قبضے پر شدید اعتراض تھا۔معاشی اور دفاعی اعتبار سے وہ چیچنیا کی اہمیت سے آگاہ تھا اور دھیرے دھیرے اینا بھی اُس سے آگاہ ہو رہی تھی۔

''چلو ھیثم اِن چھٹیوں میں مَیں تمہارے ساتھ کاکیشیا چلوں گی۔اُس علاقے کا حُسن اور اُس کے مسائل سے آگاہی تو بُہت ضروری ہے۔''

وہ ہنسا اور بولا۔

''میرا علاقہ پس ماندہ،غریب اور مسلمان ہے۔جس کی اپنی روایات ہیں۔وہاں ایسے گھومنے پھرنے کی آزادی نہیں ہوگی۔تمہیں گھر کے اندر عورتوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔''

''تو کیا ہوا؟رہ لوں گی۔دیکھو کتنی چیزوں کا پتہ چلے گا۔جب تک مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے بندہ آشنا نہیں ہوتا،اُس کی نظر میں وسعت نہیں آتی۔

''تو ٹھیک ہے میں اپنے گھر خط لکھ کر اُنہیں بتا دوں گا۔''

اینا کی تحریر اور زبان کی تیزی دونوں میں بُہت کاٹ تھی۔غلط بات پر اُس کا بولنا ضروری تھا۔ھیثم کے ہاں جذبات سے زیادہ دلیل،صبر اور استقامت تھی۔وہ زہر شہد میں لپیٹ کر دینے کا قائل تھا۔

دونوں گھنٹوں لائبریری میں بیٹھتے۔پرانے اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھتے۔لینن،سٹالن اور ٹرانسکی کا موازنہ کرتے۔سٹالن کے ظلم و بربریت پر باتیں کرتے۔ پھر اس رائے کا بھی اظہار ہو جاتا کہ رُوس نے سٹالن دور میں چھلانگیں مار کر ترقی کی۔

کبھی خروشیف کبھی برژنیف ادوار کا مقابلہ ہوتا۔ بیوروکریسی کے کردار زیرِ بحث آتے اور ماضی کی غلطیوں کو حال کے واقعات سے جوڑتے ہوئے نوّے کی دہائی میں ہر سمت پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور جرائم کے لامتناہی سلسلوں کو جو سوویت سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہے تھے، اُنہی کا نتیجہ قرار دیتے۔

مئی کے دوسرے ہفتے کے پہلے دن تومئی کو وکٹری ڈے پر سرکاری چھٹی ویک اینڈ کے ساتھ مل گئی۔ دو تین چھٹیاں مزید لینے کا دونوں نے پروگرام بنالیا اور سیر سپاٹے پر جانے کے لئے خاصے پُرجوش اور خوش و خُرّم کچھ چھوٹی موٹی خریداری کے لئے ریڈ سکوائر کی منیژ مارکیٹ جانے کے لئے بس میں جا بیٹھے۔

دن بڑا روشن اور چمک دار تھا۔ بس کی ڈرائیور جتنی خوبصورت عورت تھی، اتنی ہی بُری ڈرائیور تھی۔ بریکیں بڑے بے ہنگم طریقے سے لگاتی تھی۔ بس کوروپوٹکنسکایا Kropotkinskaya سکوائیر میں رُکی اور تین مسافر چڑھے۔ دو کے ہاتھوں میں دن میں نکلنے والے اسپیشل اخبار تھے۔ سیٹوں پر بیٹھ کر اخبار کُھلے تو ھیثم کو داہنی طرف کی عورت کے ہاتھوں میں پھیلے اخبار کے بیرونی صفحے پر تاورسکایا سٹریٹ کے ایک اعلیٰ درجے کے فوڈ سٹور گیسٹرونوم نمبر ا کے مینجر کو بدعنوانی کے الزام میں گولی مارنے کی خبر بڑی نمایاں نظر آئی۔ تفصیل میں درج تھا کہ اُس کے باغیچے کی کھُدائی کرنے پر پولیس کو گلے سڑے نوٹوں کی گڈیاں ملیں جنہیں وہ خرچ نہیں کر سکا تھا۔ ھیثم کے بتانے پر ایانا نے بھی اخبار مانگ کر پڑھا اور طنزیہ ہنکارہ مارتے ہوئے بولی۔

"بے چارہ مارا گیا۔ چچ چچ۔" اُس نے عجیب بونگے اور تمسخرانہ انداز میں زبان تالو سے چپکا کر آوازیں نکالیں پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔

"ارے وہ جو بڑے بڑے Ussurian Tigers کُھلے عام مُنہ ماریاں

کرتے پھرتے ہیں۔ کولیوں کے اصل حقدار تو وہ ہیں۔ بل ڈوزر تو ان پر پھرنے چاہئیں۔
سینے تو اُن کے چھلنی ہونے چاہئیں۔ یہ بیچارے چھوٹی موٹی چوریوں والے۔ اب دیکھو نا مٹی
میں ہی پیسے دبا تا رہا ''سٹوپڈ''۔ لمبے لمبے ہاتھ مارنے والوں سے ہی کچھ سبق پڑھ لیتا کہ
پیسے سنبھالتے کیسے ہیں۔''

اور جب وہ ترکمانیہ کے خوبصورت کشیدہ کاری سے مزین سکارف دیکھتی تھی۔
ہیثم اُس کے قریب آیا اور فیروزی رنگا دل کش آویزہ اُس کے داہنے کان سے چھوا۔

''ارے۔'' وہ ہنسی۔

دونوں شیشے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ اُس نے جھٹ پٹ پہن لیا۔ پھر
بولی۔

''دیکھو تو کیسی لگتی ہوں؟''

اُس نے میٹھی سی ستائش بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔

''اب اِنہیں خریدنا ضروری ہے۔''

اور جب وہ کافی بار پر بیٹھے کافی پیتے اور کلبا سا کھاتے تھے ہیثم نے اُسے
پہاڑوں، دریاؤں، آبی راستوں اور سرنگوں سے ڈرانے کی کوشش کی تو وہ ہنسی۔

''تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ تم سے تو میں زیادہ دلیر ہوں۔ اور رہاں رہی بات پہاڑوں،
آبی راستوں، دریاؤں اور جنگلوں کی تو بھئی میری بھی ان سے پرانی شناسائی ہے۔''

''دلیر تو تم واقعی بہت ہو۔ اعتراف کرتا ہوں میں۔'' ہنستے ہوئے ہیثم
نے اُسے دیکھا تھا۔

جس شام وہ ماسکو ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹیں خرید کر گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ

لاؤنج میں پاس پاس بیٹھے۔ھیثـــم نے اُس کی قدرے سرخی مائل تھکی تھکی آنکھیں دیکھ کر پُوچھا۔

''خیریت؟''

''ھیثـم میں ساری رات اِس خطّے کو جو بحرِ منجمد شمالی کی برفانی دلدلوں سے ہمت اور ہمالیہ تک پھیلا ہوا کبھی کا دشتِ ایشیا اور آج کا وسط ایشیا کہلاتا ہے، پڑھتی رہی ۔یقین مانو اس کی دلچسپ تاریخ نے مجھے آنکھ نہیں جھپکنے دی۔وہی وحشیانہ انسانی جبلّت ،گروہوں، قبیلوں کی مار دھاڑ، ایک دوسرے پر غلبے کی تمنا، کہیں ستھین کہیں آریا، کہیں ہُن، کہیں بابان یعنی مغل، کہیں تُرک۔

ولادیمیر ستوف، Vladmirstov نے کس خوبصورتی سے چنگیز خان ، رُوسیوں اور مغلوں کی لڑائیوں اور دشت کی تہذیبی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔وہ تمہارا جدّ امجد تُرک برلاس قبیلے سے تعلق رکھنے والا تیمور تچی بات ہے اُس کو پڑھ کر تو لطف آ گیا۔

برتھ آرام دہ تھی۔ساری رات سوئی۔صُبح کوئی آٹھ بجے قہوے کا مگ ہاتھ میں پکڑے چسکیاں بھرتے ہوئے اُس نے دریائے ''دون'' دیکھا اور ھیثم سے سُنا ہم ہزار میل کا سفر طے کر چکے ہیں اور یہ وہی دریا ہے جسے رُوس کے ممتاز ناول نگار نے خاموش دون کہا ہے۔شولوخوف یہاں قریب کے گاؤں ویشینکایا میں رہتے ہیں۔

اور وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اُتر کر انہیں ملنے نہ چلے چلیں۔''

صُبح کی روشن کرنیں ایک کے بعد ایک منظروں کا سارا حُسن آنکھوں کے سامنے لا رہی تھیں۔کہیں پہاڑ تھے، کہیں گھاٹیاں، کہیں میدانوں میں ہری کچور فصلیں، کہیں دریا اور کہیں طویل سرنگیں۔یہ سفر اگر نئی دنیائیں ، نئے لوگوں اور نئے واقعات سے روشناس کروانے جا رہا تھا تو وہیں یہ محبتوں ، چاہتوں اور نئے رشتوں میں گندھ جانے کا بھی تھا۔

اُس کی مسرّت واشتیاق قابل دید تھا۔

نوواروسینسک میں وہ اُتر گئے۔اُس وقت ایک بج رہا تھا۔لنچ کیا اور تازہ دم ہو کر انہوں نے شہر دیکھا۔دوسری جنگ عظیم کا شکار شہر، جس نے گھمسان کی لڑائی لڑی اور سرخرو ہوا۔

ہیرو چوک میں شہدا کی یاد میں نہ بُجھنے والا شُعلہ جلتا ہے۔ اسے دیکھنا اور نوواروسیسکی گجر جیسے نغمے کو سُننا بہت دل موہ لینے والا کام تھا۔یہ صرف دو منٹ کے لئے بجا۔آغاز میں گھنٹیاں بجیں۔پھر بڑی غمگین سی دُھن بکھری اور اختتام فاتحانہ سمفنی آرکسٹرا کی موسیقی سے ہوا۔

اُس نے خوشی و مُسرت سے پلکیں جھپکائیں اور ردہری ہو کر اُس کی کلائی کو پکڑ لیا۔

''ھیثم یہ بڑا خُوش کن منظر ہے۔یہاں رُکتے ہیں۔ایک بار پھر اُس سے لطف اُٹھاتے ہیں۔''

ایک گھنٹے بعد پھر وہی سین دہرایا گیا۔

اُسے موسیقی میں سرشار ڈوبتے دیکھ کر اُس نے پوچھا تھا۔

''جانتی ہو کس کی کمپوزنگ ہے؟''

اینا چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی پھر تذبذب ملے لہجے میں بولی۔

''شاید پروکوفیف کی۔''

''اوں ہوں۔'' ھیثم زوردار لہجے میں آواز نکالتا ہوا اُس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

''ابھی تم موسیقی سمجھنے میں کچی ہو۔دمیتری شوستا کووچ۔''

''اُف۔'' اینا کو جیسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بول اُٹھی۔

''یقین مانو پہلے یہی دماغ میں آیا تھا۔ پر دیکھو ہیثم یہ سٹالن کتنا بد بخت تھا۔ رُوس کے اِس عظیم فنکار کو کیسے ذلیل کیا گیا ۔ اُس کے اوپیرا The Lady Macbeth of Mtensk کو بین کر دیا تھا اُس نے۔''

''ایک شوستا کووچ پر کیا، ادیبوں، شاعروں، مصوروں، سبھوں کو ظلم وستم کی سان پر چڑھایا گیا۔''

ہیثم یہاں سے ٹرین میں اب سیدھا اپنے گھر چیچیوا ینگوش جانا چاہتا تھا۔ پر اُس نے کہا۔

''نہیں ہیثم منرالنئیے وودی تک چلتے ہیں۔تم نے یہاں کے شفا بخش چشموں اور حماموں کا ذکر کیا ہے۔ پھر پیاتی گورسک بھی وہیں قریب ہی ہے۔ ہمارے شاعر میخائل لیرمونتوف یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایسے مواقع کب ملتے ہیں۔تم تھے تو یہاں آ گئی ہوں۔ اب جو جو اہم چیزیں ہیں وہ دیکھتے جاتے ہیں۔

گاڑی سے کوئی پانچ اسٹیشن پر منرالنئیے وودی کا حسین علاقہ تھا۔ اِن کے درمیان اُس نے سیاہ اور براؤن مٹی دیکھی۔ گیہوں اور مکئی کے کھیت دیکھے۔ وسیع وعریض چراگاہوں اور باریک اُون والی ''میرینو'' بھیڑیں اور گوشت موٹا اُون دینے والی والوشا بھیڑوں کو ہیثم کے بتانے پر دیکھا۔

ریوڑوں کو چلتے پھرتے دیکھ کر اپنے تازہ حاصل کردہ علم کا ٹیسٹ بھی کیا۔ ہیثم یہ میرینو ہیں نا۔ یہ والوشا ہیں نا۔

اور ہیثم ہنس پڑتا۔

منرالنئیے وودی بہت حسین علاقہ تھا۔ چشمے اور حمام دیکھے۔ دور دراز سے آنے والے لوگوں سے ملاقات کی۔ میرا پردادا بھی تو اِسی چکر میں اِدھر منتقل ہوا تھا۔

پیاتی گورسک کے قریب وہ پہاڑ تھا جہاں میخائل نے ڈوئل لڑا اور مارا گیا اور جہاں اُس کی یاد میں سفید کالم بنا ہوا تھا اور اس پر تفصیل درج تھی۔

پُشکن کی طرح اُس نے بھی ڈوئل لڑا اور مارا گیا۔ ھیثم اُسے بتاتا تھا۔

جب وہ گروزنی کے لئے گاڑی میں سوار ہوئے۔ اُس نے کھڑکی سے باہر سٹیشن پر بکھرے پہاڑی لوگوں کو گھومتے پھرتے دیکھ کر دفعتاً پوچھا۔

''ھیثم تم ڈوئل کو کس نظر سے دیکھتے ہو؟''

''میں محبت میں شرکت کا قائل نہیں۔ یہ زبردستیوں کے سودے نہیں ہوتے۔ الگ ہو جاؤ۔ یہ کیا؟ لڑو۔ مرو۔ گھٹیا حرکت، گھٹیا کام۔

اور جب وہ جارجیا اور بلیک سی کے ساتھ جڑے اس کاکیشیائی علاقے کے پہاڑوں، اُن کی خوبصورتیوں اور رعنائیوں کو دیکھتی، اُن کے باسیوں، اُن کی روایات، اُن کے رسم و رواج اور اُن کی طویل جدوجہد آزادی کے بارے میں سُنتی اور سوالات کرتی تھی، اُسے معلوم ہوا تھا کہ کاراچائی معاشی اور تہذیبی لحاظ سے بُہت پس ماندہ قوم ہے۔ یہاں نسلوں دشمنیاں چلتی ہیں۔

''تم ہنسو گی۔'' ھیثم نے اُسے دیکھا۔ شوہر اپنی بیویوں سے بُہت کم بات کرتے ہیں۔ کچھ سال پہلے تک تو حالت یہ تھی کہ شوہر گھوڑے پر سوار ہوتا اور بیوی پیچھے پیچھے بوجھ اُٹھائے چلتی تھی۔

''اوہو۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ کتنا فنّی لگتا ہوگا۔ تو میرے دادا نے جو نقل مکانی کی وہ سمجھ آتی ہے۔''

بہر حال اب سکول کالج کھل رہے ہیں۔ تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔ یہاں قازق ہیں۔ آذری، بشکیری، کرغیری، تاتاری، ترکمانی، منگولوں اور تُرکوں کی نسلیں۔ سوویت کی

280 ملین آبادی میں 53 ملین مسلمان ہیں۔سوویت کی جنوبی ریاستوں کے یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے رُوس کے عظیم شاعر پشکن نے نظمیں لکھی ہیں۔اپنی جلاوطنی کا کچھ وقت اُس نے یہاں گذارا تھا۔

''اے گروزنی حسینہ۔'' ہیثم نے پشکن کی خوبصورت نظم اُسے سنائی۔

بُہت دور تک

دشت میں

پھیلی ہوئی چاندنی رات میں

تیرے وجود کا

پیچ وخم

تیری آواز کا،

تیرے پُرسوز گیتوں کا سوزوساز

مجھے نہ سُنا

یہ درد بھرے راگ سہانے

اے گروزنی حسینہ!

سٹیشن پر اُترنے سے پہلے وہ باتھ روم میں گئی۔اُس نے ٹخنوں تک کا لونگ سکرٹ پہنا۔نیلے اسکرٹ سے ہمرنگ بینڈ سے بالوں کو باندھا۔بالوں کو سکارف سے ڈھانپا اور جب وہ باہر آئی اُس نے ہیثم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لو دیکھو،اب تمہاری تسلی ہو جانی چاہیے۔میں تمہارے گھر کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔ہاں ہیثم مجھے یہ بتاؤ تم نے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں کیا کہا ہے؟''

''کیا کہنا تھا۔یہی کہ ماسکو یونیورسٹی کی ایک طالبہ کوعلاقے پر ریسرچ کرنا ہے۔
میری ڈیوٹی اُسے یہ کام کرانے پر لگی ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''کسی حد تک بات غلط بھی نہیں۔''

گروزنی چیچنیا کا مرکزی شہر جس سے تھوڑے فاصلے پر چیچیو اینگوش تھا۔

جب وہ اُس اُونچے محرابی گیٹ سے اندر ایک ایسے گھر میں داخل ہونے والی تھی جس کے ایک اہم فرد سے وہ اپنے دل کا معاملہ طے کر بیٹھی تھی، اُسے عجیب سے محسوسات کا احساس ہوا تھا۔سماں جھٹ پٹا سا تھا۔کشادہ آنگن کی دیواریں انگوروں کی بیلوں سے ڈھنپی پڑی تھیں۔چنامُنا سا پھل کوئی ٹنوں کے حساب سے نازک سی بیلوں پر چڑھا ہوا تھا۔بہت سارے لوگ نکل کر اُن کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔سروں کو ریشمی سکارفوں سے باندھے موٹے چنٹوں والے فراک جو ٹخنوں کو چھوتے تھے پہنے، انتہائی خوبصورت ہر عمر کی چھوٹی بڑی عورتیں اُسے حیرت و استعجاب سے دیکھتی تھیں۔داڑھیوں والے اور کلین شیو مرد اور لڑکے جنہوں نے اُونی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں۔

امام شمل کی بڑی سی تصویر برآمدے میں آویزاں تھی۔آزادی کی جنگ کا ہیرو۔ جسے رُوسیوں نے 1858ء میں شکست دی تھی۔سترھویں صدی کا یہ منفرد روایات کا حامل، اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ، وسط ایشیا کا دل، جس پر رُوسیوں کی نظریں تھیں، یورپ والوں کی اُس کے تیل کے ذخائر پر رالیں ٹپکتی تھیں، ابھی تک مسلسل اپنی جدوجہد میں مصروف تھا۔

ایک ہفتہ اُس نے اُس گھر اور اُس ماحول میں گذارا جہاں بوڑھے اور کسی حد تک نوجوان بھی نماز پڑھتے تھے۔قرآن کریم کی تلاوت ہوتی تھی۔جہاں اُونچے اُونچے

میناروں والی خوبصورت مسجدیں تھیں ۔ جہاں آنکھوں کوطراوت دیتی سبزے کی چراگاہوں میں چراتے بھیڑبکریوں اوراُن گلوں کو پالتے سادہ دل جوان اور بوڑھے تھے ۔ جہاں وادیوں اور پہاڑی سلسلوں کی سطح مرتفع پر جوار، باجرہ ،مکئی اورگندم اُگائی جاتی تھی ۔ جہاں لڑکے کی پیدائش پرخوشی کا اظہار ہوتا ۔ جہاں خاندان مل جُل کر رہنے کو اپنے لئے ایک مسرت اور خوشی سمجھتے ۔ جہاں مردوں کو پہلے اورالگ کھانا دیا جاتا تھا۔پھربچوں کی باری آتی اورآخر میں عورتیں اُس بڑے سے باورچی خانے میں جہاں رنگ برنگے ڈیزائنوں والے دبیز نمدے نما قالین بچھے ہوتے ،کھانا کھاتیں ۔چوبی ڈیزائن دارچھتیں آگ کے دھوئیں سے سیاہی مائل ہوتیں ۔دیواروں میں بنے طاقوں میں موم بتیاں جلتیں اوردیواروں میں ہی عجیب ساخت کے آتش دانوں میں آگ دہکتی ۔

یہاں اُس نے بکرے کے گوشت میں بنے چاولوں کوکھایا اوراُس کی ترکیب سیکھی ۔تازہ مکھن اورپنیر جسے Tvorog کہتے تھے اُسے اوردُنبے کی چربی سے بنے تازہ گرم نانوں کوقہوے کے ساتھ کھا کرلُطف اُٹھایا۔سادہ دل لوگ جن میں محبت اورخلوص تھا۔ دلیری اورشجاعت تھی ۔سادہ کھانا کھانے ،سادہ پہناوا پہننے اورسادگی سے رہنے والے جن پر سوویت یونین کےفوجی دستے اورخفیہ پولیس والوں نےبُہت بارظلم وستم کے پہاڑتوڑے۔ گھروں سے بے گھر کیا۔ان کی زمینوں پر قبضے کئے ۔اُن کی مسجدوں پرتالے چڑھا کرانہیں عبادت سے جبراًروکا۔

یہاں راتوں کواُس نے آگ کےگرد بیٹھ کراُن فوک کہانیوں کوسُنا جواُن کی تاریخ ،اُن کے ہیروازم ، اُن کی بہادری وشجاعت کےقصّوں کوسموئے ہوئے تھیں ۔اُس نے اکارڈین سُنا ۔ڈرم بجتے دیکھا۔

بگلماپرپرانے اناطولوی گیتوں نے اُسے جس مُسرت اورتحیرّ سے آشنا کیاوہ بیان

سے باہر تھا۔

جب وہ واپس جارہی تھی ۔ ھیثم کی چلبلی سی بہن نے اُس کے کان میں کہا۔

''تم دُلہن بن کر کب آؤ گی؟''

اُس نے حیرت سے اُس تیرہ چودہ سالہ زرافشاں کو دیکھا۔اُس کی کسی بھی حرکت سے کسی بھی تعلق کا کوئی اظہار نہ ہوا تھا۔پرلڑکیوں کی حسیات کتنی تیز ہوتی ہیں؟اُس نے بے اختیار سوچا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''جب تمہارے خدا کو منظور ہوگا۔''

''آپ خدا کو نہیں مانتی۔''

''ہاں۔شاید تھوڑا بُہت مانتی ہوں۔'' لڑکی گڑبڑا سی گئی تھی۔

اُس نے اُسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں بھرلیا اور اُس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

''ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔پڑھنے کے بعد میں نے تم لوگوں پر لکھنا ہے۔شادی وادی کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔''

اِس علاقائی سیاحت جس کا آغاز خوشی و مسرت اور سیر سپاٹے جیسے موڈ کے زیر اثر ہوا تھا۔واپسی پر دُکھ، ملال اور تاسف جیسے رنگوں سے بھر گیا تھا۔علاقہ سونا دے رہا تھا پر عوض میں چاندی چھوڑ ،پیتل چھوڑ، لوہا بھی نہیں لے رہا تھا۔اُس کے ذہنی اُفق نے وسعت اور کشادگی حاصل کی تھی اور چیزیں اپنے وسیع تناظر کے ساتھ سامنے آئی تھیں۔پہلی بار اُسے رُوس کی افغانستان میں فوج کشی پر شرمندگی اور ندامت کا احساس ہوا تھا اور اُس نے دل سے سمجھا تھا کہ رُوس انتہائی فضول اور بے کار کی جنگ میں کودا ہے جس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔

اور یہ بھی وہ اب سمجھی تھی کہ ہیثم کو کاکیشیا کے تیل اور گیس کے ذخائر پر رُوس کے قابض ہونے پر کیوں شدید اعتراض ہے۔

تیل کے سونے سے مالا مال ،قدرتی وسائل سے لدا پھندا۔ پر تعلیم اور صحت جیسے بنیادی مسائل میں بھی انتہائی پس ماندہ۔

ویک اینڈ پر ڈپارٹمنٹ کی طرف سے اُنکی کلاس کی ایک خصوصی وزٹ کالوگا KALUGA کیلئے تھی جہاں دنیا کا پہلا ایٹمی بجلی گھر ہے۔دو دن کے اِس پروگرام نے اچھا خاصا تھکا دیا تھا۔اگلے دن یونیورسٹی آئی تو جیسے ساری تھکن آڑنچھو ہوگئی تھی۔ ڈپارٹمنٹ میں خبر گردش کررہی تھی کہ انقلابی شاعر یوجینی یوٹوشینکو کا لکچر ہے۔ ہیثم غالبًا چھٹی منانے کے موڈ میں تھا اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دوپہر تک وہ اُس کا انتظار کرتی رہی ۔پھر اُس کے ہوسٹل پہنچ گئی۔ پتہ چلا وہ ابھی تک سورہا تھا۔

''بوسی کہیں کا۔''

بک بک جھک جھک کرتی وہ کیتائی گورود کے کلچرل سینٹر گئی جہاں شاعر کا لکچر تھا۔ لکچر کیا تھا۔ بیوروکریسی کا کچا چٹھا ایک ایک تفصیل کے ساتھ تھا۔ برژنیف کی اولاد کے سنہری کارناموں کی تفصیلات تھیں ۔کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زبوں حالی کی کہانیاں تھیں ۔نفسیاتی اسپتالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر رپورٹیں تھیں۔

اور آخر میں اُس کی وہ نظم پڑھی گئی جو بُہت مشہور تھی ۔اور جو اُس نے تب لکھی تھی جب اُسے حکومت پر کڑی تنقید کرنے پر نوجوان کمیونسٹ تنظیم سے نکال دیا گیا تھا۔

کتنا خوفناک ہے
کبھی کچھ نہ سیکھنا

مسندِ انصاف پر جلوہ افروز ہونے کے

حق کا دعویٰ کرنا

باغی صاف دل جوانی کو

موردِ الزام ٹھہرانا

ناپاک عزائم کے لئے

اندھے منصف

عوام کی خدمت نہیں کرتے

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اور جب وہ شاعر سے باتیں کرتی تھی اور بے حد جذباتی ہو رہی تھی کہ اُس نے کہا تھا۔

''سر یہ بڈھا کھوسٹ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اُسے موت کیوں نہیں آتی۔''

اور وہ ہنس پڑا تھا۔

اگلے دو دن اُس نے ھیثم کی جان کھالی۔تم سوتے رہے اور جانتے ہو تم نے کتنا کچھ مس کیا۔

''معافی بابا معافی۔'' اُس نے ہاتھ اُٹھا دیئے تھے۔

اب اُس نے وطیرہ بنالیا تھا۔وہ کارخانوں،نفسیاتی اسپتالوں اور جیلوں میں جاتی اکثر تو ھیثم کو بھی ساتھ گھسیٹ لیتی۔کبھی وہ بہانہ بناتا تو اکیلے نکل پڑتی۔

ایک دن جب وہ لائبریری میں بیٹھی بہت پرانے پراودا Pravda دیکھ رہی تھی۔ایک سُرخی نے فوراً متوجہ کیا۔امریکہ کے صدر کینیڈی کا خروشیف کو الٹی میٹم۔امریکہ سوویت یونین کو الٹی میٹم دے۔اُس جذباتی لڑکی کو یہ بہت بُرا لگا تھا۔وجہ کیا تھی؟تفصیل کی

طرف متوجہ ہوئی۔

''سوویت یونین کیوبا میں نیوکلیئر میزائلوں کی تنصیب بند کرے ورنہ جنگ ناگزیر ہوگی۔''

تبھی ھیثم اُس کے پاس ایک موٹی سی فائل کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ اینا نے اُسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''ذرا اِسے پڑھو۔''

اُس نے تاریخوں پر نظر ڈالی۔ 1962 کا سال تھا۔

''چین نہیں اِسے بھی۔ پنگے دیکھو۔ کیوبا امریکہ سے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دُنیا کی سپر پاور کے گھر کے دروازے پر میزائلوں کی باڑ لگا رہا ہے۔ اب دھمکیاں نہیں ملیں گی تو اور کیا ہوگا۔''

''ہٹاؤ اِسے اور یہ دیکھو۔''

یہ اُن رپوٹوں کی فائل تھی جو انڈر گراؤنڈ پریس ساند دت نے بہت اہم مُلکی ایشوز پر شائع کی تھیں۔

لائبریرین بتا رہا تھا، یہ بڑی اہم فائلیں ہیں جو صرف چھ ماہ پہلے خاص ذرائع سے لائبریری کے لئے حاصل کی گئی ہیں۔

''چلو گورباچوف کی گلاس ناسٹ Glasnost پالیسی کو دعائیں دو کہ پوشیدہ چیزیں سامنے آرہی ہیں۔''

دونوں فائل پر جھک گئے۔ واقعہ اہم اور سوویت کے جنوبی حصّے کے ایک شہر نوووچرکاسک کے ایک بہت بڑے کارخانے کی بغاوت سے متعلق تھا۔ تفصیلات دل خراش تھیں جنہیں ایک ایسے شخص نے زمانوں بعد لکھا تھا جو کے جی بی کی جیلوں میں گلتا سڑتا رہا۔

جس کا باپ بڑا اکٹر ابالشویک تھا۔ جوسٹالن کے تطہیری عمل کی بھینٹ چڑھا۔

بڑی وجوہات دو تھیں۔تنخواہوں میں تیس سے پینتیس فی صد تک کمی کی گئی اور مکھن گوشت کی قیمتوں میں اتنا ہی اضافہ کر دیا گیا۔اب ظاہر ہے گوشت مکھن تو مانگنا تھا۔ رہنے کے لئے گھروں کا مطالبہ بھی ہوا۔کام چھوڑ کر چودہ ہزار مزدور باہر نکلا تو شہر کا چوتھائی حصّہ بھی اُن کی حمایت میں ساتھ ہولیا۔مقامی پولیس کے سپاہی آئے تو اُلٹا اُنہیں منتشر کرنے کی بجائے اُن کی پیٹھ ٹھونکنے لگے۔شہر کی انتظامیہ نے فوج بُلالی۔

اب ایک نیا اور انوکھا تماشا دیکھنے کو ملا۔ٹرکوں اور جیپوں سے فوجی جوان اور جونیئر افسر چھلانگیں مار کر اُترے اور سیدھے جا کر ہڑتالیوں کے گلے لگے۔اُن کے مُنہ ماتھے چُومے اور رو لے۔

''ڈٹے رہنا۔اِن حرامزادوں کو مزہ چکھانے کی ضرورت ہے۔یہ زاروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔''

اُنہوں نے بندوقیں اُٹھائیں۔فضا میں لہرائیں اور اُن کے ساتھ یکجہتی کا اعلان نعروں کے ساتھ کیا۔سارا شہر اُمنڈ پڑا تھا۔کریملن میں تو بھونچال آ گیا۔تھرتھلی مچ گئی۔کیا ہو؟ سر جوڑ کر بیٹھے۔

تجویز ہوا کہ پس ماندہ دیہی علاقوں کی فوج بلائی جائے۔سوکا کیشیائی فوج آئی۔

''دیکھا سے۔ہیشم نے لکیر کھینچی۔'' اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی تھی۔

یہاں ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی کہ اُس فوج کے سینئر افسر کو جب گولی چلانے کا حکم ملا اُس نے فوج کے سامنے اُونچی آواز میں جیسے للکار کر کہا۔

''میں کبھی گولی نہیں چلاؤں گا۔یہ لوگ سچائی پر ہیں اور سچ کا ساتھ دینا میرا فرض ہے اور اس جان کی اوقات ہی کیا ہے؟''

پل نہیں لگایا اور خود کو گولی مارلی۔ایسا دلیرانہ شو ہوا اور مظاہرین بپھریں نہ۔کہیں ممکن تھا؟ وہ میدان کارزار جما کہ لاشوں کے انبار لگ گئے۔بے پناہ جانی نقصان۔ مقدمات۔جیلیں۔

لیکن چونکانے والی خبر وہ تھی کہ خودکشی کرنے والے فوجی کی بیوی کو گھر سے پکڑ کر جیل میں لایا گیا سالوں اُسے وہاں رکھا گیا۔اِس وقت وہ شاید کسی نفسیاتی اسپتال میں ہو۔

وہ ساکت بیٹھی تھی۔چہرے کو خوبصورت ہتھیلیوں کے ہالے میں لئے۔

''بہت ڈپریشن میں آگئی ہو۔چلو آؤ۔کافی پئیں۔''

گھونٹ گھونٹ کافی پیتے، اُس سے باتیں کرتے، گیت سُنتے اچانک اُس نے کہا۔

''ہیثــــم کیوں نہ ہم سمولنسک Smolensk ضلع کے ساچیکوفکا مقام پر بنائے گئے نفسیاتی اسپتال چلیں اور اُس عورت کی کھوج کریں شاید وہ وہاں ہو۔''

''چلیں گے کس دن؟ وہ اگر نہ ملی تو کوئی اور مل جائیں گے۔''

وہی ہوا۔وہاں ماریا جوفی سے دونوں کی ملاقات ہوگئی۔وہ سٹالن کی نہیں خروشیف کے کسی معتمد رکن کے غصے کی بھینٹ چڑھی تھی اور کئی سال جیل میں رہنے کے بعد اب اسپتال منتقل ہوئی تھی۔

اُس نے ایسے ایسے دل خراش واقعات سنائے، وہ کانپ اُٹھی تھی۔عورتیں اِن جیلوں میں کیسے طوائفیں بنیں۔

تفصیلات دہلانے والی تھیں۔لیبر کیمپوں کی حالت زار، ٹھنڈ کا قہر اور روٹی کا قحط اسکی آنکھوں سے آنسو نہ خشک ہوتے تھے۔واپس آکر اُس نے فیچر تیار کیا۔ہیثــــم کو پڑھایا۔کچھ کانٹ چھانٹ اُس نے کی۔اب اُسے چھپوانے کا مسئلہ تھا۔پر

واواPARAVDA زمانوں پرانا اخبار تھا۔کمیونسٹ پارٹی کا اخبار، سچ کا معنوی علمبرار ہی نہیں حقیقتاً تلخ سچ کا نمائندہ ۔جی چاہتا تھا کاش اس میں چھپے۔

''ارے اتنے بڑے اخبار نے ہرگز گھاس نہیں ڈالنی۔'' اُس نے سوچا۔

اُس نے تو آج تک سوائے اپنی اسائنمنٹوں کے کبھی ایک لفظ نہیں لکھا اور نہ وہ کہیں چھپا۔نہ کوئی اُسے جانتا ہے۔اب وہ کسی اخبار تک پہنچے تو کیسے پہنچے؟

''چلو ابھی اِسے سنبھالو۔دیکھتے ہیں۔'' **ھیثم** نے کہا۔

پر اُسے کب چین تھا۔اگلے ہی دن وہ اکیلی تاورسکایا سٹریٹ پر''**ازولیستیا**'' اخبار کے دفتر جانے کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔بے چینی ،اضطراب اُس کی ہر حرکت سے مترشح تھا۔اُس کی کیفیت کسی دور دراز گاؤں میں رہنے والی اُس نوعمر لڑکی جیسے تھی جو یکا یک ماسکو جیسے شہر میں آ گئی ہو۔

پشکن سکوائر پر اُتری۔پشکن کے مجسمے پر گئی۔اُسے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں خود سے بولی۔

''سچ اور انصاف کا علم بلند کرنا چاہتی ہوں اور تم سے دُعا کی طلب گار ہوں۔''

پھر کسی سے پُوچھا۔اُس نے کہا۔

''رُوسیا سینما گھر کے ذرا بائیں طرف جاؤ۔وہیں ہے۔''

تھرڈ فلور پر دو تین لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر نے کہا۔

''مضمون دے جاؤ دیکھیں گے۔''

''نہیں۔'' وہ اپنے آپ سے بولی۔

دفعتاً شیشے کے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے ایک انتہائی حسین چہرے نے اُسے روک لیا۔چند لمحے وہ کھڑی دیکھتی رہی پھر دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔یہ نینا

گورباٹوف Gorbatov تھی۔ ازویستیا کی فیچر رائٹر۔ اتنی میٹھی سی۔ دلداری کے لفظوں سے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اُسے خوشی ہوئی۔

اُس کا حُسن کا کیشیائی عورتوں جیسا تھا۔ جن کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں بندے کا دل بے اختیار ڈوبنے کو چاہے۔ اُس کی پیشانی سے لے کر گردن تک ایسی جاذبیت تھی کہ جو نگاہوں کو ہٹنے نہیں دیتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پُوچھ بیٹھی۔

دھیمے سے لہجے میں اُس نے کہا۔

''میں ناگورنا قرابخ Nagorna Karabakh کی آرمینین ہوں۔''

اُس کے چہرے پر ناواقفیت کے رنگ دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

''یہ ریپبلک آذربائیجان کے اندر آرمینیائی لوگوں کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو آرمینیا ریپبلک کی سرحدوں سے قریب تر ہے۔ ہم لوگ آرمینیا کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں مگر آذربائیجان کو یہ بات پسند نہیں۔''

بڑی دلچسپ گھلنے ملنے والی لڑکی تھی۔ اُس سے کوئی دو تین سال بڑی ہوگی۔ اُس کے وہاں بیٹھے بیٹھے اُس نے مضمون پڑھ ڈالا اور پُوچھا بھی کہ وہ کب سے لکھتی رہی ہے؟ اور یہ جان کر یہ اُس کی پہلی تحریر ہے اُس نے کہا تھا۔

''لگتا نہیں۔''

اینا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تو آپ پر عاشق ہوگئی ہوں۔ کوئی حوصلے بڑھا دے تو یہ بھی اُس کی عین نوازش ہے۔''

ھیثم سے ملنے پر اُس کے قصیدے ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

''یار بس بھی کرو۔ اِس نینا کی جان چھوڑ دو اب۔''

''اللہ۔ھیثم تم اُس سے ملے نہیں۔ملو گے تو پُوچھوں گی۔''

تین دن بعد اُس کا مضمون چھپ گیا۔زمین پر ایڑی نہ لگتی تھی۔ھیثم کو ڈھونڈتی رہی کہ ساتھ چلے اور شکریہ ادا ہو اور ملاقات بھی۔

ھیثم ملا نہیں وہ خود ہی نکل پڑی۔جب آفس پہنچی وہ کہیں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

''چلو گی۔'' اُس نے پُوچھا۔

''کہاں؟''

''بس سیر سپاٹے پر۔مجھے بھی میرا ایک دوست لے کر جا رہا ہے۔''

وہ ابھی ہاں ''یا'' ناں میں کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ خود ہی بول پڑی۔

''ارے چلو چلو تھوڑی سی ایکٹو یٹی ہی رہے گی۔زندگی کا یہ رُخ بھی دیکھو۔''

وہ حیرت زدہ سی کھڑی اُس گاڑی اور گاڑی میں بیٹھے نوجوان کے انداز دیکھتی تھی۔ایک تو گاڑی جہازی سائز کی۔سیٹیں حد درجہ دبیز اور آرام دہ۔ٹی وی، ٹیلی فون نصب۔

اور یہ الیا منکوف کیا شے تھا۔اُلجھے ہوئے بڑے بڑے بال، نشے سے مخمور آنکھیں، موٹے موٹے لٹکتے ہونٹ اور کمبخت امیر کتنا لگتا تھا۔نینا کا دوست تھا۔

یہ خزاں کے دن تھے۔ماسکو کی مصروف شاہراہوں سے باہر نکلتے ہی فطرت ننگی ہو کر دل میں اُترنے لگی تھی۔ماسکو کے شب و روز بہاروں میں مُسکرانے اور گرمیوں میں ہنسنے کے بعد اب برف کے سفید اور دُھندوں میں لپٹے دنوں میں اُترنے والے تھے۔آسمان کو اب اتنا نیلا اور شفاف نہیں رہا تھا پر ابھی بھورے رنگ بھی نہیں چڑھے تھے اِس پر۔دھوپ ہنوز خوبصورت تھی اور اتنی بد رنگی پر نہیں اُتری تھی۔برچ کے پیڑوں نے ٹنڈ مُنڈ ہونا شروع

کردیا تھا۔ درختوں کے پتوں کے سنہرے پیلے جامنی ہرے رنگوں کے حُسن اپنی بہاریں دکھا کر اب اپنے آخری سفر پر تھے۔

بارشوں کے موسم سر پر منڈلا رہے ہیں۔جنگل سیاہ پڑنے والے ہیں۔اُن کی سیاہی اُسے ہمیشہ بہت ہانٹ کرتی تھی۔

وہ کہیں دُور چلی گئی تھی۔اپنے گھر، اپنے کھیتوں اور مانوس سے ماحول میں۔ سرجیوپوساد قصبے سے ذرا آگے صنوبر کے گھنے جنگلوں، شاہ بلوط کی گھپاؤں اور والگا کے نیلے پانیوں کے عکس مارتے پس منظر میں ایک عالیشان دومنزلہ مخروطی چھتوں والا چوبی گھر نظر آیا تھا۔سیاہ تارکول کی سڑکیں دائیں بائیں راستے کاٹتی ڈرائیو وے کو جا ملتی تھیں۔

یہ الیا منکوف فیملی کا ڈاچا گھر تھا۔اِدھر اُدھر بکھری انتہائی قیمتی بے شمار گاڑیاں یہ بتاتی تھیں کہ بہت سے لوگ یہاں موجود ہیں۔

حیرت زدہ سی وہ اُتری۔نینا اور الیا کے ساتھ اندر آئی۔ڈاچا کی شان وشوکت کا اگر یہ عالم ہے کہ نگاہیں واپسی کا راستہ بھول جاتی ہیں تو اِن کے گھر زاروں کے محلات سے کم نہیں زیادہ ہی شاندار ہوں گے۔

امیر ترین خاندانوں کے بگڑے ہوئے لڑکے لڑکیوں کے والگا کے بے کراں پانیوں پر تماشوں سے لے کر رات گئے تک پینے پلانے، کھانے پینے، مستقبل کی باتیں کرنے اور عیاشیوں کے رنگ ڈھنگ اور راطوار کے جو جو اظہار اُس کے سامنے آئے وہ اُسے حیرت زدہ کرنے، اُس کی خوبصورت آنکھیں پھاڑنے اور اُس کا اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کے لئے کافی تھے کہ اِن کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔یہ فقط دُنیا کو فضلہ دینے آئے ہیں۔

پر جلد ہی اُسے یہاں آنے کی غرض وغایت معلوم ہوگئی اور یہ اُس کے لئے ایک

اور اچنبھا تھا۔ انتہائی امیر ترین لوگوں کی یہ اولادیں ماسکو میں ایک Millionaires club قائم کرنے کے اقدامات کا جائزہ لینے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔

تو اب علم دوست کلبوں کی بجائے لکھ پتی کلب بنانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ یہ سوشلسٹ حکومتیں ہیں جن کی اکثریت ماضی میں کیمونسٹ نظریات کی حامل بھی رہی ہیں۔

شب کے تیسرے پہر جسموں کی جو دھما چوکڑی مچی وہ بھی اُس کے حسابوں کراہت آمیز تھی۔

اگلے دن شام کو واپسی ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل نینا نے پُوچھا۔

''تمہارے علم میں یقیناً بہت اضافہ ہوا ہوگا؟''

وہ ہنس پڑی۔

''یقیناً ہوا ہے۔''

ھیشم سے ملنے اور اُس کے پُوچھنے پر کہ وہ کل کہاں تھی؟ اُس نے ایلس ان ونڈر لینڈ کی کہانی اُسے سُنا دی۔

''ھیشم ڈاچا ہالینڈ کے پھولوں سے سجا اور مہکا پڑا تھا جو بطور خاص ہوائی جہاز سے منگوائے گئے تھے۔ فرانس کی بہترین شمپین وہاں پانی کی طرح بہتی تھی۔ رُوس کے مشرق بعید کے ٹیگاؤں (جنگلوں) کے پلے ہوئے بٹیروں کے بار بی کیو۔ فراوانی کا وہ عالم کہ اُن کے کُتے بھی یقیناً منہ نہ لگائیں۔ دُنیا کا کون سا پھل وہاں موجود نہ تھا۔ مجھے تو اُن کے نام بھی نہیں آتے تھے۔''

اُس نے باتیں کرتے کرتے دفعتاً کلائی کی گھڑی کو دیکھا اور ہڑ بڑا کر بولی۔

''ھیشم پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔ چلو چلو بھاگو۔''

پر کوئی دو ہفتے بعد ایک دن جب وہ بالشوئی تھیٹر کے سامنے فوارے کے کنارے بیٹھے آبی موتیوں کی لڑیوں کو دیکھتے اور محظوظ ہوتے تھے دفعتاً ہیشم نے ڈاچا میں گذاری ہوئی رات کے بارے میں ایک مبہم سا سوال کیا۔ اُس کے ہونٹوں پر یہ اظہار دبا دبا سا تھا پر آنکھیں بڑی واضح تھیں۔

آنکھوں کی اِس زبان نے اُسے تلملا سا دیا۔

''سٹ پٹ''

اُس نے ایک دوہتڑ اُس کے شانے پر مارا۔ غُصے سے تمتاتے ہوئے پہلے کھڑی ہوئی پھر بیٹھ گئی۔

''جانور نہیں ہوں میں۔ وہ ریوڑوں میں گھومتے پھرتے جب اور جس وقت اور جو سامنے آیا سے جُت جاتے ہیں۔ یا وہ انسان جو جانوروں جیسی خصلتوں کے مالک ہوں۔ نفرت ہے مجھے ایسے لوگوں سے۔ تم نے مجھے اتنا بھی نہیں سمجھا۔ اپنے ماحول سے کتنی مختلف لڑکی ہوں میں۔''

یونیورسٹی کے قیام نے اُن کی ذہنی، فکری اور عملی تینوں طرح تربیت کی۔ مطالعہ کا تو انہیں شوق تھا ہی۔ اب عادی بھی ہورہے تھے۔ لائبریری میں گھنٹوں بیٹھنا، نایاب اور اہم کتابیں پڑھنا، نوٹس لینے، سیاسی حالات پر ہفتہ وار، ماہانہ پرچوں اور ڈیلی اخبارات میں لکھنے کی چھوٹی موٹی مشق نے نہ صرف اُنہیں رواں کیا بلکہ تھوڑا سا قارئین سے متعارف بھی کروادیا۔

دونوں بھرپور انداز میں میدانِ عمل میں اُترے اور دن رات جدوجہد میں مصروف ہوئے۔

اینا کو آزاد اخبار ''نوایا'' میں سیاسی رپورٹر کی جاب مل گئی ۔ھیثم ''دی ماسکو نیوز'' میں چلا گیا۔

ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن کوئی پانچ بجے ھیثم نے اپنی چابی سے فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھولا۔ خیال نہیں تھا کہ وہ ہوگی پر گیلری سے آگے لاؤنج سے آتی روشنی نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ "گورکی" سے آچکی ہے۔ بے آواز چلتا ہوا جب وہ اور آگے بڑھا۔ اُس نے دیکھا تھا وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی دُنیا و مافیہا سے بے خبر لکھنے میں جُتی ہوئی ہے۔ دروازے کی جانب اُس کی پُشت تھی۔

وہ اُس کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔ بڑے لیمپ کی روشنی میں کاغذ پر جو بکھرا ہوا تھا وہ ہائیڈروجن بم کے اہم رُوسی موجدوں میں سے ایک سخاروف کا انٹرویو تھا۔ جو ''گورکی'' میں نظر بند تھا۔ صفحے پر دردناکیوں میں لتھڑے پُتھوے سخاروف کی سوتیلی بہو بیٹی کے جذبات تھے جو باہر جانے کی خواہش مند تھیں اور جنہیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی مطالبے کی منظوری کے لئے بھُوک ہڑتال پر تھے۔

اُس نے سر سیدھا کیا۔ لمبی سانس بھری۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کہر اور دُھند نے شیشوں کو دُھندلا دیا تھا۔ وہ پھر پلٹا۔ اُس پر جھکا۔ اُس نے اپنی ٹھوڑی عین اُس کی چمکتی لمبی مانگ کے آخری سرے پر رکھ دی اور دونوں بازو اُس کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے گنگنایا۔

''پہلے بم بناتے ہیں پھر امن کا پرچار کرتے ہیں۔''

وہ مسکرائی ۔ اُس نے اُس کے بالوں سے پُرصحت مند خوبصورت ہاتھ اور بازو کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپایا۔ پیار بھرا بوسہ دیا اور گردن اُوپر کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکی۔

''دیکھو ھیثم یہ ظلم کی انتہا ہے۔''

''یہ بھی آئن سٹائن بن گیا ہے۔پہلے دُنیا کو مروا دیا۔پھر دُکھ اور تاسف کا اظہار شروع ہوگیا۔خیر سے مغرب کے میڈیا کو تو موقع ملے رُوس کو لتاڑنے کا۔پر یہ بھی جب ایسے تباہ کن کام کرتے ہیں تب انہیں احساس نہیں ہوتا۔حکومتوں کو تباہی کے سامان بنا کر سونپتے ہوئے انہیں دُنیا پر چھا جانے کی ترغیب دینے کے یہ لوگ بھی تو مجرم ہیں۔

''مت بھولو ھیثم جوانی جینئس لوگوں کے جوشِ عمل،صلاحیتوں اور ٹیلنٹ کے اظہار کا وقت ہوتی ہے۔انہیں کسی نہ کسی میدان میں کچھ نہ کچھ نیا دریافت یا ایجاد کرنا ہوتا ہے۔دُنیا اُس سے کس انداز میں فیض یاب ہوتی ہے،یہ بعد کی بات ہے۔اب اگر عمر کے کسی حصے میں غلطی کا احساس ہو جائے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔

ھیثم ہمارا سخاروف تو پھر قابلِ فخر ہے کہ اُس نے صرف چھتیس (36) سال کی عمر میں ایٹمی ٹیسٹ بند کرنے اور جینئس سائنس دانوں کی اسلحہ ساز کارخانوں میں تعیناتی کے خلاف آواز بلند کر دی تھی۔اب ایسا شخص امریکہ رُوس ڈائیلاگ کی بات کرتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کی اسرائیل عرب جنگ میں رُوس کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے،افغانستان میں رُوسی فوج کشی کی سخت مذمت کرتا ہے تو وہ امن کا ہیرو ہے۔کتنا ظلم ہو رہا ہے اس پر؟اور رہاں دیکھنا یہ بھوک ہڑتال اُسے بسترِ مرگ پر لے جائے گی۔

'' چچ۔چچ۔چچ۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''تم ہنستے ہو ھیثم۔'' وہ روکھی آواز میں بولی۔

''تو کیا کروں؟اینا تمہیں سخاروف پر ہونے والے ظلم کا تو احساس ہے۔اُس کی بہو بیٹی کی فکر ہے۔اگر نہیں فکر تو اِس بندے کی۔مجھے بتاؤ۔کچھ میرے بارے میں بھی سوچ لو۔ نینا کا کہنا ہے کہ یہ سب میری کمزوری کا نتیجہ ہے۔

اب اپنے پیرو مُرشد پشکن کی طرح میرا بھی دل اپنا گھر بنانے، سجانے، گھر والی کے ہاتھوں بنے گوبھی کے سوپ کا پیالہ پینے اور اُسے اپنے سامنے دیکھتے رہنے کو چاہتا ہے۔

اب اُس کے کھلکھلا کر ہنسنے کی باری تھی۔

''بس تمہاری تان اسی پر ٹوٹتی ہے۔پلیز یہ مضمون دیکھو میں نے ابھی بھیجنا ہے۔میں کافی بنا کر لائی۔''

کافی کا سپ لیتے ہوئے اُس نے اتنا کہا۔

''یہ پوائنٹ بھی شامل کرو۔''

''افغانستان میں رُوس کی مداخلت پر اُس کے واضح اور دوٹوک موقف پر اُسے اُس کے اعزازات اور القابات سے محروم کر دینا حکومت کا گھٹیا اور کمینہ پن ہے۔

حکومتوں کو شاید یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں گھٹیا اور کمینے کام ضرور کرنے ہیں۔گورباچوف ایسی ساری کمینگیاں اپنے پیش رووں کے کھاتے میں ڈالتا تھا۔بار بار رجتا تا تھا۔پھر خود بھی وہی کام کرنے لگا۔

جونہی سنٹرل کمیٹی نے یہ قرارداد منظور کی کہ بزنیف اور چیرنکو کے ناموں کی تختیاں گلی محلّے یا کسی شاہراہ پر جہاں جہاں نصب ہیں اُتار لی جائیں۔پبلک لائبریریوں سے بزنیف کی کتابیں اُٹھالی جائیں۔اینا کو تو تپ چڑھ گئی تھی۔

اُس نے لمبا چوڑا زہریلا سا مضمون لکھ مارا۔

اگلے دن ایڈیٹر کے حضور طلبی ہوئی۔

اُس نے پیٹھ ٹھونکی اور ساتھ کہا زہر ذرا شہد میں لپیٹ کر دو۔کڑواہٹ اور تلخی نگلی جاتی ہے اِس سے۔''

دوست تو دونوں کے مشترکہ تھے۔وہ سب بھی ھیثم کی طرح چاہتے تھے کہ اب ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔نینا نے پورا پروگرام مرتب کر ڈالا تھا۔سبھی تھوڑا ہلا گلا کرنے اور رونق میلہ منانے کے موڈ میں تھے۔زیگ والوں نے دو ماہ کی تاریخ دی تھی۔

اُس دن وہ شام کو واپس آئی۔ھیثم گھر میں موجود تھا۔ٹانگیں میز پر رکھے کسی کتاب کے مطالعے میں گم۔ڈائننگ ٹیبل پر دو بڑے سے پیکٹ پڑے تھے۔وہ راہداری سے ہی شور مچاتی اندر آئی تھی۔

''میں ارباط سٹریٹ سے سپیشل پیروشکی (روسی سموسے) لائی ہوں۔اتنے خستہ اور لذیذ ہیں کہ کھاؤ گے تو مزہ آجائے گا۔

وہاں کوئی نوٹس ہی نہیں تھا۔وہ چپ چاپ کتاب میں گم رہا۔

اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے اور تمسخرانہ تاثرات چہرے پر بکھیرتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور بولی۔

عزت مآب توجہ فرمائیں گے۔اُس نے سموسوں سے بھرا لفافہ اُس کی آنکھوں کے سامنے نچایا۔

''دیکھو تو میں کتنے مزے کی چیز لائی ہوں۔''

''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ بولتے نہیں۔''

جھنجھلاتے ہوئے دفعتاً اُس کی نظریں بے اختیار کھانے کی میز پر دھرے خوبصورت پیکٹوں پر پڑیں۔اُسے چھوڑ کر وہ فوراً اُن کی طرف لپکی۔اُس نے ایک پیکٹ اُٹھایا۔پھاڑا۔اندر سے بے حد خوبصورت پھولوں والا لونگ سکرٹ، بلاؤز اور سکارف نمودار ہوئے۔

اُس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''کچھ بولو گے بھی۔''

''بس تیار ہو جاؤ۔ ابھی نکاح کے لئے چلنا ہے مسجد۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ارے تم تو پکے بنیاد پرست مسلمان نکلے ہو۔''

''اب جو تمہاری مرضی ہے سمجھو۔''

''پر تمہارے ہونٹوں کو تالے کیوں لگے ہوئے ہیں؟''

''دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ جنونی بلّی کی سی آنکھوں والی لڑکی خیر سے وقت پر گھر آجائے۔ اور مجھے معزّز امام کے سامنے شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے۔''

''ھیثم اب اِس کی کوئی ضرورت تھی۔''

اُس نے خوبصورت بلاؤز کو تنقیدی نگاہوں سے جانچتے ہوئے کہا۔ وہ نکاح کے بارے میں کہتی تھی۔

''بھئی ہے اور بہت ہے۔ اب میں اپنے پانچ وقت نماز پڑھنے والے باپ اور ماں کے استفسار پر کہ نکاح کیا ہے یا ویسے ہی اُس کے ساتھ رہ رہے ہو۔ جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''اور ہاں اِس میں کیا ہے؟'' وہ اِس دوسرے پیکٹ کو تو بھول ہی گئی تھی۔

''اِس میں نکاح کا ضروری جُـــــزچھوہارے ہیں اور منہ میٹھا کرنے کے لئے کوئین آف سپیڈ Spade ہے۔''

چائے کے بعد ھیثم فون پر مصرُوف ہوا اور وہ تیار ہونے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آکر اُس کے پاس کھڑی ہوئی اور بولی۔

''تم ابھی تک فون کے ساتھ ہی اُلجھے ہوئے ہو۔''

اُس نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔پھر اُس کے بالمقابل کھڑا ہوگیا۔تھوڑا سا جھکا۔کوہ یُورال کی کانوں اور پہاڑوں کے ہیرے پتھر سے بنے انتہائی خوبصورت چھوٹے سے ہار اور بُندوں کو اُس کی گردن اور کانوں میں پہنانے کے بعد سیدھا ہوا۔اپنی بانہوں کے کلاوے میں سمیٹے اُسے لاؤنج کے بڑے آئینے کے سامنے لے آیا۔

مُسکراتے ہوئے آئینے سے مخاطب ہوا۔

''میں کچھ کہوں گا تو میری بات اِس نے ہنسی میں اُڑا دینی ہے۔تم کہو گے تو شاید یقین کرے۔ذرا اِس سے پُوچھو۔یہ اینا جو اِس وقت سامنے کھڑی ہے یہ تو پہچانے میں نہیں آرہی ہے۔سارا وقت اُس اونگی بونگی اینا کو خود پر سوار کیوں رکھتی ہے؟ایسے ہی سج سنور کر رہنے میں اِسے کوئی تکلیف ہے کیا؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کمال ہے ہیثم۔''

میرا پراسپکٹ کی مسجد میں کافی لوگ تھے۔آرمینیائی،بلغاری،اُزبک،رُوسی،بشکری اور قازق۔خاصی تعداد تھی۔سب بُہت خوش ہوئے۔معزّز امام نے کلمہ پڑھایا۔پھر نکاح ہوا۔چھوہارے اور مٹھائی کھائی گئی۔ہاتھوں کو اُٹھا کر کامیاب اور محبت بھری زندگی کے لئے دعائے خیر ہوئی۔''آمین'' کہنے میں سبھی پُر جوش تھے۔اینا نے اِس ساری صورت سے بُہت حظ اُٹھایا۔

اگلے دن نینا کو ہنس ہنس کر تفصیل سنائی۔

دو ماہ بعد جب زیگ والا سلسلہ شروع ہوا۔تب سب دوستوں کو بُلانا پڑا۔خوب محفل جمی۔رات بُہت دیر تک شراب نوشی،کھانا اور ڈانس ہوئے۔یار لوگوں نے شادی میں

نہ صرف بھرپور شرکت کی بلکہ خوب لُطف بھی اُٹھایا۔

صُبح کوئی بارہ بجے وہ سوکر اُٹھا۔اینا نہیں تھی ۔شاید باہر ہو۔اُس نے سوچا اور لاؤنج میں آیا۔سب یار دوست کوئی صوفوں پر،کوئی میٹرس پر اور کوئی کونے کھدروں میں اوندھے سیدھے قالین پر بکھرے پڑے تھے۔

اینا سارے گھر میں نہیں تھی ۔یہ کہاں چلی گئی ہے؟اُس نے تھوڑی کوفت اور بیزاری سے سوچا۔

ٹی وی کھولا تو جان گیا کہ وہ کہاں ہے؟چرنوبل میں ایٹمی پاور پلانٹ پر زبردست حادثہ ہو گیا تھا۔ پلانٹ پر کام کرنے والے سینکڑوں افراد کی فوری ہلاکت اور قریبی جگہوں کے متاثرین کے بارے میں خبریں نشر ہو رہی تھیں۔کسی تخریب کاری کا نتیجہ؟۔کسی بے احتیاطی کی وجہ یا کوئی تعمیراتی فالٹ۔ابھی تو کچھ کہنا مشکل تھا۔

پر تین بجے جب سب بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔اُن کی متفقہ رائے تھی کہ اب حکومت چاہے جو مرضی بیان بازیاں کرے۔جوہری توانائی میں جس جدید ریسرچ اور پیش رفت کی ضرورت ہے سوویت انڈسٹری اور سوویت نیوکلیئر پاور اس میں پیچھے ہے۔اُلٹے سیدھے تجربات کی ناکامی ماحولیات کی تباہی کا سبب بن رہی ہے۔

''اور اس بیوقوف اینا کو تو دیکھو۔بھاگنے کی کیا جلدی تھی ۔یوکرائن کوئی ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے ۔عجیب جنونی ہے یہ لڑکی بھی ۔شادی کا ہنگامہ ابھی گرم ہے۔گھر میں دوست ہیں اور وہ خود غائب ہو گئی ہے۔''

نینا کو غُصہ آیا ہوا تھا۔

صرف دو دن بعد سب کچھ سامنے آ گیا تھا۔ پاور سٹیشن پر غیر مستند تجربات ری ایکٹر میں آگ لگنے کی وجہ تھے۔آگ کنٹرول سے باہر ہو کر شدید ترین نقصان کا باعث

بن رہی تھی۔

کوئی تین دن بعد وہ آئی۔ نڈھال تھکی تھکی۔ اِس اتنی بھیانک تباہی پر ماتم کناں۔

اب نئی ایکٹویٹی شروع ہوگئی تھی۔اس حادثے نے تپر نوبل سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دیا۔جس کا نصب العین مدد اور تحفظ ٹھہرا۔وہ نہ صرف اِس سوسائٹی کی ممبر بنی بلکہ سرگرمی سے کام بھی کرنے لگی۔ایک دن جب وہ اِس نئے پراجیکٹ پر کام کررہی تھی اس نے کہنا ضروری سمجھا تھا۔

''اپنا تمہیں تھوڑا وقت گھر کو اور اِس غریب بندے کو بھی دینا چاہیے جو تمہاری نظر کرم کا محتاج رہتا ہے۔''

لاؤنج میں گیس پائپ کے عین اُوپر دیوار پر سوویت یونین کا بڑا سا نقشہ ٹنگا تھا۔ ھیثم منہ دھوکر آیا تھا تو لئے سے صاف کرتا ہوا وہاں جا کر کھڑا ہوگیا۔

''دیکھو اپنا اُس نے نقشے کی طرف اشارہ کیا۔سوویت کتنا بڑا ہے؟ لوگ کیا تمہاری طرح دیوانے ہوگئے ہیں۔زندگی میں توازن پیدا کرو۔کبھی تم نے جو کچن دیکھا ہو؟ کبھی کوئی اچھی ڈش بنائی ہو۔

اُس نے یہ سب سُنا تھوڑی دیر چُپ رہی۔پھر دھیرے سے بولی۔

''ھیثم تمہیں یہ سب معلوم تو تھا کہ میں بس ایسی ہی ہوں۔''

''ہاں مجھے معلوم تھا پر اِس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ تم ساری زندگی اسی جنون اور اسی بے ترتیبی سے گذاردو۔تھوڑی سی توجہ تو گھر اور شوہر مانگتا ہے اور تم اُس تھوڑی سی کے لئے بھی حد درجہ کمینی بن رہی ہو۔''

وہ بڑبڑائی ضرور مگر زیادہ نہیں۔اُٹھ کر اُس کے پاس آئی۔اُس کے گلے لگی۔کچن

میں گئی۔بورشش Borshuss سوپ بنایا۔پلیٹی بنائی۔سویٹ ڈش کےطور پرآئس کریم فرج سے نکالی۔

چلواُس کی اِس ذراسی توجہ نے اُس کا موڈ خوشگوار کر دیا۔

کچھ وقت اچھا گذر گیا۔پھر ایک دن قدرے زوردار لڑائی ہوئی۔

اُس نے رُوس کی خاتون اوّل رئیسہ گورباچوف کا انٹرویو کیا۔فائنل کر کے کمپیوٹر سے اُٹھی تو وہ بیٹھ گیا۔سارا پڑھ چکنے کے بعد بولا۔

''دیکھو یہ حصّہ کاٹ دو۔''

''کیوں؟'' اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''وہ اگر کیڈی لک گاڑی میں سفر کرتی ہے۔مہنگے ترین غیر ملکی کپڑے استعمال کرتی ہے تو تمہیں کیا؟''

''حد کرتے ہو ہیثم ۔وہ چلاّئی۔مجھے کیوں نہیں کچھ؟ مجھے تو سب سے پہلے اعتراض ہے۔وہ مُلک کی نمائندہ خاتون ہے۔ماسکو یونیورسٹی میں لینن ازم اور مارکسزم پر لیکچر دیتی ہے اور حال اُس کا یہ ہے۔کتنا تضاد ہے اُس کے ہاں۔''

''تمہیں اگر پہننا اوڑھنا نصیب نہیں تو اوروں کو دیکھ کر برداشت کیوں نہیں؟ ملنگوں کی طرح زندگی گذارنے کا انداز اپنا رکھا ہے۔کبھی جو ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔کبھی جو چہرے کی زیبائش ہو۔

وہ چند لمحوں کے لئے رُکا۔اُس کی آواز اندر کی تلخی سے بھڑکی ہوئی تھی۔

کسی مُلک بھی گیا۔وہاں کی مارکیٹوں میں گھومتے پھرتے صرف اور صرف ایک چہرہ آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔یہ رنگ سجے گا اُس پر۔خرید لیا۔کیسا شاندار بریسلٹ ہے۔کلائی اور خوبصورت لگے گی۔گردن میں اچھی لگے گی یہ چین۔معلوم نہیں کن ڈبوں میں

میرے وہ جذبات بند ہیں ۔

سُنو اینا لوگوں کو جینے دو ۔اُن کے راستے بھی کھوٹے کرنے پرتُلی ہوئی ہو ۔''

وہ حد درجہ سفا کی پر اُترا ہوا تھا ۔اُس کے لہجے میں کمینگی کی انتہا تھی ۔

وہ ٹھیک کہتا تھا مگر وہ بھی تو ایسی باتوں کی عادی نہ تھی ۔بھونچکی سی ہو کر چند لمحوں کے لئے اُسے دیکھتی رہی ۔شاکڈ کی سی حالت میں پھر چلائی ۔

''اُف ھیثم یہ تم پاگل ہوگئے ہو کیا؟''

اب وہ اُس پر چڑھائی کے لئے دوڑی ۔ پہلے تھوڑی سی دیر اُس سے گتھم گتھا ہوئی ۔ پھر ھیثم نے اُسے اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑ لیا ۔اُس کے سنہری بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ۔

''اینا مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تم سے وقت چاہتا ہوں ۔ جو تمہارے پاس نہیں ۔ میں تمہیں سجا سنورا دیکھنا چاہتا ہوں ۔جس کی تمہیں فرصت نہیں ۔ میں بچہ چاہتا ہوں ۔جس کے لئے تم تیار نہیں ۔تمہی بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

وہ اُس کی بانہوں کے حصار میں بہت دیر تک کسی چھوٹے معصوم سے بچے کی طرح سمٹی رہی ۔

''میں کیا کروں ھیثم ۔مجھے اپنا اندر فرسٹریٹڈ محسوس ہوتا ہے ۔کبھی کوئی خواہش سر بھی اُٹھاتی ہے تو ساتھ ہی قطار در قطار مسائل کے انبار آ کھڑے ہوتے ہیں ۔''

''تم نے دُنیا کا ٹھیکہ نہیں اُٹھا رکھا ہے ۔جس کا یہ کام ہے اُسے کرنے دو ۔تم نے صرف اپنے حصّے کا اُتنا ہی کرنا ہے جو تمہارے لئے مخصوص ہے ۔حد سے بڑھ جاؤ گی تو نقصان ہوگا ۔

اینا میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں پر یاد رکھو کہ میں ایک مرد بھی ہوں ۔محبت

کرنے والا اور چاہنے والا ایک مرد۔''

کچھ وقت ٹھیک گذر گیا۔ پھر وہی قصہ ۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بڑے بڑے جھگڑوں میں بدلنے لگی تھیں اور اُنہی دنوں میں سوویت بھی ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا۔

....

ہوائیں ظالم و جابر لوگوں کی طرح چنگھاڑتی پھرتی تھیں۔ ٹُنڈ مُنڈ درختوں کی ویرانی اور اُنکی سیاہی سفید اور بُھر بُھرے سے بھرے منظروں میں خوفناک سی دِکھتی تھی ۔

تھکاوٹ بھی تھی اور نڈھالی بھی محسوس کر رہی تھی ۔ جب کام سے لوٹی اور گھر میں داخل ہوئی تھی ۔ آنے کے ساتھ ہی اُس نے پرس کی سٹریپ کندھے سے اُتار کر بیگ کو یوں صوفے پر پھینکا جیسے وہ نہایت بیکار اور فضول چیز ہو۔

ھیثم کی طرف دیکھا۔ اُس وقت ھیثم کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اُسے بھی کوئی فضول اور بیکار شے سمجھتی ہو جو مُفت میں آنکھوں کی راہ میں حائل ہو رہی ہو۔ کُرسی پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اُس نے دونوں بازو میز پر پھیلاتے ہوئے سر اُن کے درمیان رکھ دیا۔

کتنی دیر بیت گئی۔ لاونج میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ باہر دُھند اُتر رہی تھی ۔ کھڑکیوں کے شیشے دُھندلا رہے تھے ۔ اور اندر اُس کا رویہ جذبات و احساسات کو دھندلا رہا تھا۔ وہ کوفت اور بیزاری سے کھڑا ہوا۔ کمرے میں چند چکر کاٹے ۔ شیشوں سے سڑک پر کچھ دیکھنے کی کوشش کی پھر واپس آیا۔

''اینا۔ کیا بات ہے؟''

اُس نے سر اُٹھایا۔ گھائل نظروں سے اُسے دیکھا۔ کچھ کہنے کی بجائے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ ٹی وی شور کی آواز سے آن ہوا۔ ابھی سکرین پر دُکانوں کے سامنے ڈبل روٹی اور واڈکا کے لئے لمبی قطاروں کا منظر اُبھرا ہی تھا کہ اُس نے کھٹ سے اِسے دوبارہ بند کر دیا۔

وہ اُٹھی ۔ کچن میں گئی ۔کھانے کو کچھ نہیں تھا ۔باہر نکلی اور بولی ۔

''گھر میں تو کچھ بھی نہیں ۔''

''گھر تمہارا بھی ہے، میرا ہی نہیں ۔اُس کی ذمہ داری تم پر بھی ہے ۔''

''اُف''۔ اُس نے لمبی سانس بھری تھی ۔

باہر واڈکا کے لئے لمبی قطاریں، کھانے پینے کی چیزوں کے حصُول کے لئے قطاریں ، روبل کو ڈالرز میں تبدیل کرنے کے لئے قطاریں، ریگن اور دوسرے مغربی لیڈروں کی گورباچوف کی تعریفوں کی لمبی قطاریں، گورباچوف اور یلسن کے جھگڑوں کے لمبے سلسلے ۔اِن سب کے درمیان اُس کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی قطاریں جواب گھریلو مسائل کے علاوہ ملکی حالات پر بھی اختلاف کی صورت میں لمبے لمبے جھگڑوں کا باعث بننے لگے تھے ۔

''تمہارے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہو گیا ہے؟ تم کتنے ڈیمانڈنگ اور ظالم ہو رہے ہو۔آج کل کتنی ٹینشن ہے؟ قوم کی بقا داؤ پر ہے ۔ملک بھی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر جیسے کھڑا ہے ۔تمہیں کوئی پرواہ ہی نہیں ۔''

''کس قدر افسوس ہے تم پر ۔کس حق سچ پر کھڑی ہو تم؟ میں تو غلام ہوں سوویت کا میری بلا سے ۔کل کا ٹوٹتا آج ٹوٹ جائے ۔مائی فٹ جو بویا تھا وہی کاٹنا ہے اِسے ۔''

اُس وقت وہ بڑی ڈیپرس سی تھی ۔کچھ زیادہ بولی نہیں ۔بس تھیلا اُٹھایا اور باہر نکل گئی ۔

وہ سوچوں میں گُم سُم بیٹھا تھا۔پھر جیسے خود سے بولا۔سوویت کے حالات کی طرح اُس کی محبت بھی اُس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں کسی بھی لمحے کوئی دھماکہ ہو سکتا ہے ۔

وہ دیر بعد آئی ۔ کچن میں گئی ۔سوپ بنایا۔کھانے کی میز پر رکھا اور اُسے صوفے

میں دھنسے بیٹھے کو بازو سے پکڑ کر اُٹھا کر لائی ۔اور جب وہ چھوٹی چھوٹی بائٹ لیتا اور سوپ پیتا تھا وہ بُہت متاسف سا تھا کہ آخر اُس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تھا جو وہ خود چیزیں لے آتا؟ کتنی مشکل اور تکلیف سے وہ یہ سب لائی ہوگی ۔شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ اُٹھا اُس نے اُس کے بالوں پر پیار کرتے ہوئے اپنے سینے سے بُہت لمبی سی سانس نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''اینا شاید تم یہ کبھی نہ سمجھ سکو کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں اور تمہاری توجہ کا کتنا رہتا ہوں۔''

وہ بھی بھری بیٹھی تھی ۔اُس کے سینے سے لگی تو جیسے برسات سی ہوگئی۔

وہ ٹی وی پر سوویت یونین کی کونسل آف منسٹرز کے چیئرمین نکولائی رژکوف کے ساتھ سوال جواب میں گورباچوف کی گورنمنٹ کا تیاپانچہ کرنے پر تلی بیٹھی تھی ۔اناج اور آلو وافر مقدار میں موجود مگر دوکانوں پر کیوں نہیں؟ سگریٹ فیکٹریوں میں بکثرت موجود مگر دکانیں خالی ۔گوشت گوداموں میں سڑ رہا ہے ۔مگر لوگوں کو مل نہیں رہا۔

رژکوف کی ہر بات تو وہ گاجر مولی کی طرح کاٹتی تھی ۔نظریاتی طور پر وہ سوشلزم کی حامی تھی ۔لینن محبوب لیڈر تھا۔ پر حالات جس نہج پر آگئے تھے وہاں کسی بھی ازم کا اب کوئی سوال نہیں رہا تھا۔سرمایہ داری کے لئے سب راستے ہموار ہورہے تھے ۔سوویت یونین کی ملحقہ ریاستوں کے حوالے سے بات ہوئی ۔بالٹک ریپبلکیں لتھوینیا، لتویا اور استھونیا میں ایجی ٹیشن اور 1940ء سے پہلے کے سٹیٹس پر جانے کے مطالبے پر بات ہوئی ۔کاکیشیائی ریاستیں اور اُن کا مستقبل کھُل کر زیر بحث آئے ۔مشرقی جرمنی چیکوسلواکیہ رومانیہ اور ہنگری کے حالات بھی نظر انداز کرنے والے نہ تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے اِس پروگرام کے بعد جب وہ گھر آئی ۔ایک گرما گرم بحث اُس

کے انتظار میں تھی۔

''اینا اپنے نقطۂ نظر میں ذرا وسعت پیدا کرو۔ لوگوں کے دل کی بات سُنو اور سمجھو۔ سٹالن کی طرح اپنے حقوق اور آزادی کے لئے ہلکی سی آواز بھی تم سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''ھیثم تمہیں یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ ریاستیں اگر آزادی چاہتی ہیں تو یہ اُن کا حق ہے۔ مسئلہ اگر ہے تو دُنیا میں رُوسی عظمت، وقار اور مقام کا۔ لیکن اِن کی غلط پالیسیوں کی تو میں خود سب سے بڑی نقادہوں۔''

''اب کوئی پُوچھے کہ اِس وقار کو داؤ پر لگانے والے کون ہیں؟ افغانستان میں پنگوں کی ضرورت تھی بھلا۔ دراصل مہم جوئی کا جنون چین لینے نہیں دیتا نا۔ کیوبا پر ضرورت سے زیادہ مہربانیاں۔ مشرقی یُورپ پر عنایتیں۔ ریپبلکوں پر جھکے۔ ہتھیاروں اور میزائلوں کی دوڑ میں سبقت کا جنون۔

عام رُوسی بے چارہ تو لائنوں میں کھڑا ہے جس کی آدھی دیہاڑی ایک ڈبل روٹی کے حُصول میں گزرتی ہے۔ وہ کیوں نہ چلائے اور کہے۔ اپنا آپ سنبھالو۔ چار سو بکھیڑے ڈالے ہوئے ہیں۔ دُنیا کے آدھے رقبے پر قبضہ کئے بیٹھے ہو۔ اب جان چھوڑو اُن سب کی اور اپنی نبیڑو۔

مغرب اور آئی ایم ایف کے ہتھکنڈے آنے والے سالوں میں دیکھنا تو سہی کیا کیا رتماشے دکھاتے ہیں۔''

بظاہر دونوں بڑے باریک بین تھے۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک معاشی اور اقتصادی میدانوں میں کِن کِن ذلت آمیز ہتھکنڈوں سے سوویت یونین کا گلا گھونٹنے اور اُسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ خود گوربا چوف کیا چاہتا تھا۔ یلسن کے عزائم کیا تھے؟ ملک تیز رفتاری سے کِس نہج پر جا رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں ھیثم

زیادہ تیز تھا۔اُس کے تجزیے حقیقت کے زیادہ قریب ہوتے۔

اینا کویلسن سے زیادہ اُمید تھی۔اُس کے عوامی انداز اُسے پہلے حکمرانوں سے مختلف لگے تھے۔کم ازکم اُس کی صورت میں وہ ایک اُمید، روشنی کی ایک کرن ضرور دیکھتی تھی۔

ھیثم اُس سے قطعی متفق نہیں تھا۔وہ یلسن کو نِرا فراڈ اور ڈرامہ باز خیال کرتا تھا۔ اِن دنوں وہ اکثر اُسے کہتا۔

''اینا یلسن کو ذرا گہرائی میں جا کر دیکھو۔بڑے گھٹیا اور چھچھڑے انداز ہیں اُس کے۔تم جیسی سمجھدار بھی اُس کے فریب میں آ گئی ہے تو بے چارے عام رُوسی تو کسی گنتی میں شمار نہیں؟ لوگوں نے بڑی اُمیدیں وابستہ کر لی ہیں۔

ھیثم ہنستا تھا۔اُس کے لب و لہجے کی نقلیں اُتارتا تھا۔

''مجھے سرکاری گاڑی نہیں چاہیے۔ڈرائیور کی ضرورت نہیں۔''

اب وہ عام لوگوں کی طرح میٹرو سے سفر کرتا ہے۔مارکیٹوں پر چھاپے مارتا ہے۔تقریروں میں بیوروکریسی کے لتّے لیتا ہے اور بلّے بلّے کے نعرے لگواتا ہے۔کل دیکھنا۔اسی بیوروکریسی کے بغیر وہ سانس بھی نہیں لے سکے گا۔سورڈ پووسک کا یہ بورس یلسن پورا ایکٹر ہے۔آنے والے دنوں میں اس کے رنگ دیکھنا۔باپ ہے سب کا۔

1990ء میں Kuznetsk کوزنسک کے علاقے میں رُوسی کان کنوں کی ہڑتال اتنی ہمہ گیر اور شدید تھی کہ گورباچوف کی حکومت ہل کر رہ گئی۔

اگست کے تیسرے ہفتے کی وہ صُبح بڑی روشن، چمکدار اور کھلی کھلی سی تھی۔اینا نے سفید نیٹ کے پردے جھٹک کر اکٹھے کئے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔سمولنسکایا چوک کا

تھوڑا سا منظر اِس کھڑکی سے نظر آتا تھا۔سناٹا بکھرا پڑا تھا۔دو مینک آہستہ آہستہ حرکت میں تھے۔

''تو پھر فوج نے بغاوت کر دی ہے۔''

اُس نے اپنے آپ سے کہا اور لاؤنج میں آکر ٹی وی آن کر دیا۔سکرین پر اہم خبر کی پٹی چل رہی تھی۔

گورباچوف شدید علیل ہیں۔حالات کی نزاکت کے پیش نظر ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے۔

وہ بیڈروم میں گئی۔ ھیثم سو رہا تھا۔اُس نے اُس کا بازو ہلایا اُس کی نیم وا کھلی آنکھیں دیکھ کر اُس نے خبر سنائی۔

وہ خفیف سا ہنسا اور بولا۔

''چلو جارج بُش کا انتظار ختم ہوا۔بیچارہ اپنے بیلی گورباچوف کو فون پر ڈرا ڈرا کر مار رہا تھا۔''

جب وہ دونوں چائے پیتے اور کھڑکی سے باہر سڑکوں کی ویرانی دیکھتے تھے۔

ھیثم نے کہا۔

''لو گورباچوف گیا اور یلسن آیا۔''

ھیثـــم نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ایسا بالعموم نہیں ہوتا تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کو اِس حد تک سمجھ چکے تھے کہ کسی بھی نازک صورت میں ایک دوسرے کے دل و دماغ میں اُٹھنے والے سوالات و خدشات کو بغیر بتائے سمجھ لیتے تھے۔چند لمحوں تک وہ اُسے دیکھتا رہا پھر رسان سے بولا۔

''اب امریکہ اور مغرب کے سامنے گھگھیانے ،جھکنے اور رینگنے سے ہمیں تو نفرت

ہے۔ پر اِن لیڈروں کو کون سمجھائے؟ فوج میں اضطراب اور بے چینی ہے۔ یلسن اُن کے لئے انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اب تاریخ کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ فوجی بغاوت کیا گُل کھلاتی ہے؟ دیکھو۔"

اور جب ھیثم نہانے کے لئے گیا۔ اُس کے ذہن میں الاؤ دہک رہا تھا۔ ملک بڑے خطرناک موڑ پر آ گیا تھا۔ پتہ نہیں اُس وقت وہ کیوں بُہت کمزور ہو رہی تھی۔ دل سے چاہتی تھی کہ جو کچھ بھی ہو ملک وقوم کے لئے بہتر ہو۔ سچی بات ہے اِن ذلیل لیڈروں نے رُوس کی آن بان اور شان داؤ پر لگا دی تھی۔

پُشکن دل کے اندر سے نکل کر ہونٹوں پر آ گیا تھا۔ ہر عہد اور ہر زمانے کا شاعر آنکھیں بھیگ رہی تھیں جب وہ اُسے گنگنا رہی تھی۔

اپنی رگ رگ میں زندگی کی آگ باقی ہے
آبرومندی کا دل میں راگ باقی ہے
تو اے دوست آؤ اور اپنی اِس سرزمین کو چمن کر دیں
اپنے بے پایاں جذبوں کو وطن کی نذر کریں
وہ تارا جو ہر اک دل کو خوشی سے گھیر لیتا ہے
وہ تارا زندگی کے افق پر طلوع ہو گا
ہمارا رُوس جو مدت سے گہری نیند سوتا ہے
یکا یک جاگ جائے گا جو اعلان صُبح ہو گا
اُس بوسیدہ نظام کے ٹوٹے ہوئے ایک ایک ٹکڑے پر
میرا اور تمہارا نام ہی زیب نظر ہو گا
میرا اور تمہارا نام ہی زیب نظر ہو گا

میرااورتمہارانام ہی زیبِ نظر ہوگا

(ظ انصاری)

پتہ نہیں ضبط کیوں جواب دے گیا تھا۔آنسو اک تواتر سے بہنے لگے تھے۔ناشتہ بنانے کیلئے کچن میں گئی۔تو تب بھی ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھا۔

ناشتے کے بعد دونوں کام پر نکل گئے۔اینا جلدی آ گئی۔کھانا تیار کرنے کے دوران ہیثم بھی آ گیا تھا۔وہ کچن میں تھی۔وہیں اُس کے پاس آ کر بولا۔

''اینا ابھی کوئی تبصرہ،کوئی حاشیہ آرائی،کوئی بیان،کچھ مت دینا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔اِس مختصر سے احمقوں کے فوجی ٹولے نے بغیر کسی پلاننگ کے قدم اُٹھالیا ہے۔یلسن تو صدارتی عمارت میں موجوداور توڑ جوڑ میں مصروف ہے۔

وہ چُپ چاپ میز پر چیزیں رکھنے لگی۔آج سارا دن اُس نے جس صورتِ حال کا سامنا کیا وہ بے حد مایوس کن تھی۔اِس فوجی بغاوت کی قیادت وزیر دفاع یازوف اور گینا ڈی کرر ہے تھے۔اوّل درجے کے اِن بیوقوفوں کی منصوبہ بندی بودی اور مخالفین کے ساتھ بے رحمی سے نمٹنے کی صلاحیت سے قطعی عاری تھی۔

روٹی اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں اُلجھے ہوئے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اُنہوں نے دونوں دھڑوں پر لعنت بھیجی تھی اور سڑکوں پر نکلنے کو پسند ہی نہیں کیا۔

اگلے چند دن بڑے کربناک تھے۔جمہوریائیں ایک کے بعد ایک آزادی کا اعلان کرتی جارہی تھیں۔

جس دن یوکرائن نے اعلان کیا۔ہیثم کھانے کی میز پر بیٹھا ہی تھا۔اُس نے ڈونگے سے سُوپ پیالے میں ڈالا اور سنجیدگی سے بولا۔

''جمہوریہ یوکرائن تو چلو پھر بھی رُوسی دباؤ کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتی ہے

مگر یہ بقیہ جمہوریائیں جن کی معیشتیں ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہیں رُوسی ہتھکنڈے اور جھٹکے برداشت نہیں کر پائیں گی ۔ذرا یلسن کے پاؤں جمنے کی دیر ہے تماشے دیکھنا پھر۔ابھی چیچنیا کی طرف سے بھی اعلان متوقع ہے۔

فوجی بغاوت ناکام، گورباچوف کا بوریا بستر گول اور یلسن بیوروکریسی کے اُس دھڑے کے مونڈھوں پر سوار جو کھلم کھلا سرمایہ داری کی بحالی کے لئے سرگرم تھا اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوگیا تھا۔

اور اُس دن اینا نے کہا۔

''ھیثم تم ٹھیک کہتے تھے۔''

جس دن ٹی وی پر ایک اعلان دونوں نے ایک تسلسل کے ساتھ دیکھا اور سُنا۔ ایک ٹیلیفون نمبر کہ ہر خاص و عام کی اطلاع کے لئے کہ فوجی بغاوت کا ساتھ دینے والے آپ کے ہمسائے یا واقف کاروں میں اگر کوئی ہے تو مطلع کریں۔

ھیثم نے اُونچی آواز میں ہنستے ہوئے کہا۔

اینا ہم تو ہمیشہ سے حکومت کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔اب تیار ہو جاؤ۔یا تمہیں پھانسی لگائیں گے یا مجھے۔

''پتہ نہیں کیسے چلے جا رہے ہیں اب تک۔''

مراجعت کے اِس سفر کو جو اُس کے حسابوں بڑے روشن دنوں سے شروع ہو کر دُھند بھرے دنوں تک پھیلا ہوا تھا۔اُس نے اُسے مضطرب اور بے قرار کر رکھا تھا۔

کریملن پر سوویت کا جھنڈا اُتار کر صرف رُوس کا جھنڈا لہرانے کے عمل کو دیکھنا لوگوں کے لئے مسرت اور انبساط سے بھرا ہوا تھا۔ریڈ سکوائر میں خلقت اُمنڈی پڑی تھی۔ لوگ دو اُنگلیاں لہراتے ہوئے وکٹری کا نشان بناتے تھے۔

فوجی بغاوت کی ناکامی پر مسرت وشادمانی کا اظہار تھا۔ہتھوڑا اور درانتی سُرخ جھنڈے سے یوں کاٹ پھینکی گئی تھی جیسے وہ کسی تحریک کا سمبل نہیں کوئی اچھوت شے تھی۔ ہاں البتہ لینن گراڈ سے پیٹرزبرگ کی واپسی پسندیدہ تھی کہ جس نے تاریخ بنائی، اُسے اُس سے محروم کردینا بھی زیادتی تھی۔

ہر گذرتے دن ایک نیا شوشہ جنم لیتا۔ایک نیا رُوح فرسا منظر سامنے آتا۔لتھوینیا کے کیپٹل سٹی ولینیس Vilnius میں اُس کے محبوب لیڈر لینن کے مجسمے کو ہٹائے جانے کا منظر کتنا دل خراش تھا۔پر یہ بھی کتنا بڑا المیہ تھا کہ جنگِ عظیم دوم کے جرنیل اپنے تمغوں کو سینوں پر سجائے ریڈسکوائیر میں کھڑے روٹی اور روبل کے طلب گار تھے۔

زارشاہی دور کی طرف واپسی کرتے ہوئے ستر اسی سالہ وقت کو منہا کرنے کی حماقتیں زوروشور سے جاری تھیں۔زارشاہی کا زمانہ بہترین، آرتھوڈوکس چرچ ہمارا ایمان اور سٹیٹ ایگل امتیازی نشان بحال۔بڑے ظالمانہ دن تھے۔

گاڑی عام طور پر اینا کے پاس ہوتی تھی۔ہیثـــــم عام رُوسی مردوں کے برعکس زیادہ لبرل تھا۔اُس کے بُہت اصرار کے باوجود کسی اشد مجبوری کے تحت ہی گاڑی لے کر جاتا۔

بالعموم وہ اکٹھے نکلتے۔اینا اُسے چھوڑتے ہوئے اپنے دفتر آجاتی۔آج گاڑی گیراج سے نکال کر وہ خود اسٹیرنگ پر بیٹھا۔اُسے دفتر اُتارتے ہوئے اُس نے کہا۔

”تین بجے تک اپنے کام نپٹالینا۔کہیں چلنا ہے۔“

وہ پُوچھتی رہی۔کہاں؟ کہاں؟ اُس نے جواب دینے کی بجائے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

ڈاکٹر دونوں کی دوست تھی۔ دونوں کو دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔ ھیثم نے بے تکلفی سے کہا۔

''اپنی رپورٹ میں لے آیا ہوں۔ اِسے چیک کرنا آپ کا کام ہے۔ میں بچہ چاہتا ہوں۔ اِسے منائیں اور دیکھیں بھی۔''

پہلے وہ ہنسے سے اُکھڑی۔

''ھیثم کھانے کو روٹی نہیں مل رہی ہے اور تمہیں بچہ چاہیے۔''

''چلو چار پانچ نہ سہی ایک دو تو ہونے ضروری ہیں۔'' وہ اُسکے غصّے کو یکسر نظر انداز کرتا ہوا ہنسا۔

''اُف چار پانچ۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ ہاں بچہ تو چاہ رہے ہو اِسے پالے گا کون؟''

''میں۔'' اُس نے ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے گردن بڑے فدویانہ انداز میں جھکائی۔

ڈاکٹر ہنستے ہوئے حظ اُٹھا رہی تھی۔

''چلو اُٹھو چیک کروں تمہیں۔ عجیب ہو۔ عورتیں بچوں کے لئے مری جاتی ہیں۔''

واپسی پر وہ چُپ تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے برتنوں کو دھوتے اور اُنہیں سمیٹتے ہوئے اُس نے کوئی بات نہیں کی۔

پر جب وہ اُس کے ساتھ لیٹی اُس نے کہا۔

''تو اگر مجھ سے بچہ نہ ہوا تو؟''

''اینا تم بھی کمال کی عورت ہو۔ بھئی نہ ہوا نہ سہی۔ کوشش کرنی ضروری ہے۔''

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اگلے دن نینا اپنے شوہر اور دونوں بچوں کے ساتھ اُن

کے گھر آ دھمکی ۔اُس کا آنا کوئی نیا نہ تھا۔ پہلے بھی وہ آتی رہتی تھی ۔بچے بھی ساتھ ہوتے پر عجیب سی بات ہوئی ۔

جیسے خاموش مدتوں سے بند پڑے ساز پر کوئی موسیقار اپنی اُنگلیاں چلا دے۔ سُر نکال کر فضا میں بکھیر دے۔ کچھ ایسا ہی اُس کے ساتھ ہوا تھا۔

جب وہ سب یلسن اور اُس کی مخالف پارلیمنٹ پر زوروشور سے بحث کرتے تھے ۔کلنٹن کی تڑپ اور اُس کی بے چینی کا ذکر ہوتا تھا ۔امریکن ایڈ اور جی 7 کی طرف سے امدادی پیکج کے دیئے جانے پر بات ہوتی تھی ۔

''مضبوط کرو یلسن کے ہاتھ ،کلنٹن کو تو مصیبت پڑی ہوئی ہے ۔'' نینا کہتی تھی ۔

کچن سے نکل کر تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اینا نے کہا۔

''دیکھ لو پھر جی 7 کی طرف سے اِس 42 بلین ڈالر کی امداد کا حشر کیا ہوا۔ رشوتوں کے زور پر ریفرنڈم جیت کر پارلیمنٹ کو تحلیل کر دیا یلسن نے ۔''

''سب کا خیال تھا کہ صدر اور پارلیمنٹ کے درمیان یہ محاذ آرائی زیادہ دیر نہیں چلنی چاہیے ۔یہ ملک کے لئے بہت نقصان دہ ہوگی ۔''

اُن کے جانے کے بعد اُس نے کہا۔

''ھیشم میں کتنی عجیب اور فضول عورت ہوں ۔نینا کے بچوں نے آج مجھے بہت بُری طرح اِس کمی کا احساس دلایا ہے ۔''

''چلو تمہیں احساس ہوا یہی کافی ہے ۔اب تھوڑی سی توجہ تو کرو گی ۔پر مجھے یہ بھی بتاؤ کہ آج تم گرجی برسی نہیں ۔''

''ارے ۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنسی ۔کھانا بنانے میں جو مصرُوف تھی ۔''

اپنے مزاج کے برعکس اُس نے اپنے احساسات کا اعتراف تو ضرور کیا

تھا۔ پر اندر خانے وہ جس طرح کے محسوسات سے دوچار ہوئی تھی۔ اُس کو ظاہر کرنا کچھ اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔

....

یہ دن بڑے اہم تھے۔ یلسن اور پارلیمنٹ میں اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ پارلیمنٹ کا دھڑا جو بیوروکریٹوں، پرانے سٹالنسٹوں اور فوج پر مشتمل تھا۔ حکمت عملی سے خالی تھا۔ عوام اور مزدوروں کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یلسن نے کے جی بی، پولیس اور فوج کے سرکردہ جرنیلوں کو ڈالروں کے بریف کیس دیئے اور وائٹ ہاؤس پر قبضہ کرلیا۔

ذاتی طور پر اُس نے کبھی اِس بات کو پسند نہیں کیا تھا کہ وہ کسی بھی چیز کو سٹور کرے۔ ہمیشہ وہ روزمرّہ چیزوں کو اتنا ہی خریدتی جتنی اُس کی ضرورت ہوتی۔ گذشتہ ماہ ھیشم گوشت کوئی مہینہ بھر کا لے آیا تھا۔ چینی چاول میدہ وہ لے آئی تھی۔ کس دقّت سے اُس نے یہ چیزیں خریدیں۔ اُس کا احساس اُسے قطاروں میں کھڑے ہونے سے ہوا۔ بالعموم وہ اپنے تعلقات کی بنا پر بلیک مارکیٹ سے خرید لیتے تھے اور اُس کوفت اور تکلیف سے بچ جایا کرتے تھے۔ جو اِن دنوں متوّسط اور غریب رُوسیوں کا مقدّر بنی ہوئی تھی۔

گذشتہ چار ماہ سے اُسے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ بہت سے نئے اخبار نکلے۔ اُنہوں نے اُسے زیادہ بہتر آفر دی مگر اُس نے سوچا دفع کرو۔ ماسکو نیوز کا ہی ایک نیا پرچہ Ogonyuk نکلا۔ جس کی آغاز کی اشاعت ہی تین لاکھ سے ہوئی تھی۔ کو پرچہ کی اشاعت اُس وقت کوئی بیس لاکھ ہو چکی تھی۔ پر ملکی حالات کا اُس پر بھی اثر تھا۔ ھیشم کی تنخواہ سے گذارہ ہو رہا تھا۔

حالات کا جبر شدید اور بے رحم تھا تو موسم بھی ایسی ہی بے رحمی پر سزا دے رہا تھا۔

جنوری کی برف باری ماسکو کے گلی کوچوں میں اپنی شدتوں سے اُتری ہوئی تھی۔

اُس دن اُس کا آف تھا۔ ھیثم دفتر تھا۔بارہ بجے تک تو سوتی رہی۔پھر ناشتے کی ٹرالی کچن سے گھسیٹ کر لاؤنج میں لے آئی کہ چلو ٹی وی بھی دیکھتی ہوں اور ناشتہ بھی ہو جائے گا۔

اُسی وقت ھیثم کی کال آئی وہ پوچھ رہا تھا۔

''تمہارے پاس کچھ دنوں کا گذارہ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''ٹی وی کھولو اور دیکھ لو۔اگر کچھ چیزیں خرید کر لاسکتی ہو تو لے آؤ۔وگرنہ پھر فاقے تو ہیں ہی۔''

اُس نے ٹی وی آن کیا وہاں اِس اچانک اعلان کی گونج اور دھمک سنائی دی تھی۔ حکومت نے اشیاء پر سے کنٹرول ختم کر دیا تھا۔

اُس نے اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا۔فُل کوٹ پہنا۔ٹوپی اوڑھی۔تھیلا اُٹھایا اور نکل کھڑی ہوئی۔ مارکیٹ سے اول تو چیزیں غائب تھیں اگر کوئی مل رہی تھی تو دس گنا زیادہ داموں پر۔یہیں اُسے معلوم ہوا کہ وائٹ ہاؤس کے سامنے لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کو دفع دور کرتے ہوئے وہ رُوسی سپریم سوویت کی عمارت کی طرف بھاگی۔

لوگوں کا کوئی ہجوم تھا۔وائٹ ہاؤس،میئر ہاؤس اور ماسکو دریا کے کنارے کی سڑک سمولنسکایا تک لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔اُس نے تھیلا کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ تصویریں کھینچیں،رپورٹ بنائی اور دفتر بھاگ گئی۔

رَسد زرقابو سے باہر،افراطِ زر کی شرح انتہائی بلندیوں پر۔اُچکے بدمعاش،بلیک

مار کیٹیئے، مافیا، سٹے باز، سب یلسن کے ساتھی دوست جن کے لئے صرف اپنے مفادات اہم۔اُن کے ڈالر محفوظ۔انگلینڈ اور یورپی ملکوں میں خریدی گئی جائیدادیں محفوظ۔عام لوگ اور ملک جائے بھاڑ میں۔

اگلے تین چار سالوں پر پھیلی ملکی کہانیاں بُہت خوفناک تھیں۔حکومت کے شرمناک کردار تھے۔وہ جس ریپبلک میں چاہتی ہنگامے کروا دیتی جہاں چاہتی امن ہو جاتا۔جارجیا میں ہونے والی ابخاز بغاوت اُسی لمحے دم توڑ گئی تھی جب جارجیا کے صدر ایڈورڈشیورڈ ناڈزے نے رُوس کی طرف سے پیش کردہ اُس امن معاہدے پر دستخط کئے جس نے عملاً جارجیا کی آزادی کو ختم کر دیا۔اندر کے اِن شرمناک انکشافات پر دونوں نے لکھتے ہوئے بُہت سفاکی سے کام لیا۔وقت کے ساتھ ساتھ دھمکیاں مل رہی تھیں بھلا وہ انہیں خاطر میں لاتے۔

چیچنیا لوہے کا چنا بن کر رُوس کے دانتوں تلے آ گیا تھا۔چبائے تو کیونکر۔دانت ٹوٹنے کے لالے پڑ گئے تھے۔پہلا حملہ اعلان آزادی کی سزا دینے کے لئے ہوا اور دوسرا طاقت کچلنے کے لئے۔یہ حملے اتنے بھرپور اور شدید تھے کہ دونوں دُکھی ہو گئے۔دونوں نے جی داری سے لکھا۔

96ء کے صدارتی انتخابات سر پر تھے۔ھیثم،اینا،نینا اور اُس کا شوہر خروشیف بُہت سے دوسرے نڈر اور بے باک صحافی میدان میں یلسن کے خلاف صف آرا تھے۔اُس وقت بھی اُن دونوں کے ساتھ نینا اینا کے آفس میں تھی۔ھیثم اس معرکے میں زیادہ کھُل کر نمایاں ہوا تھا۔

غیر متوقع نتائج۔سب سے زیادہ ووٹ چیچنیا سے ایک ایسے شخص کے لئے جس نے چیچن عوام کا قتل عام کیا اور اُن کی سر زمین کو خون میں نہلا دیا۔

سینٹ پیٹرز برگ میں صُبح تک تو پولنگ سٹیشنوں پر کچھ بھی نہیں تھا حالانکہ شہر موجودہ حکومت کے حامیوں کا گڑھ تھا۔شام چار بجے جیسے کسی نے الٰہ دین کے چراغ کی طرح کم ٹرن آؤٹ کو ایک بڑے ٹرن آؤٹ میں بدل دیا۔علاقہ جتنا دور اور دُشوار گذار تھا، صدر کی حمایت اتنی ہی زیادہ تھی۔

بشکریا کی مسلمان آبادی جو کمیونسٹوں کو سپورٹ کرتی ہے وہاں بھی حالات حیران کن تھے۔زیوگانوف چلاّ تا رہا تھا۔

''اب چلاّنے کا فائدہ۔اُلّو کے پٹھے کو کہا بھی تھا کہ انتخابی مہم کو صحیح طرح منظّم کرو۔رُوسی بورژوازی اور مغرب نے کسی طور بھی تمہیں جیتنے نہیں دینا وہ تو جیتے جی مر جاتے یلسن اگر ہار جاتا۔''

ھیثم نے سگریٹ ایش ٹرے میں جھاڑی۔

''ھیثم تماری خیر نہیں۔تم تو یلسن کی نظروں کا کانٹا بن گئے ہو۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں ہمیشہ سے ایک خاموش کانٹا ہوں۔''

کوئی ڈیڑھ ماہ بعد کی بات ہے۔اینا نے شام کو کام سے واپسی پر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔اُسے اُمید تھی کہ ھیثم آچکا ہوگا۔صُبح اُس نے کہا تھا۔ھیثم مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ذرا وقت سے آجانا۔

گھر میں اندھیرا تھا اور سناٹا بھی اُس نے پورے گھر کی بتیاں جلائیں اور ھیثم کو کال کیا۔اُس کا موبائل بند تھا۔چند لمحے وہ موبائل کو گھورتی رہی۔

ھیثم کبھی لاپروائی نہیں کرتا تھا۔وہ البتہ ایسی ضرور تھی۔شام کے بعد اگر اُس کی

کوئی مصروفیت ہوتی تو وہ ہمیشہ اُسے مطلع کرتا۔

وہ کچن میں گئی۔فرج کھولا فش نکالی۔سینڈوچ بنائے۔کافی کامگ بنا کر وہ میز پر آ گئی۔ایک بار پھر اُس نے نمبر ملایا۔کوئی جواب نہیں تھا۔کافی پیتے اور سینڈوچ کھاتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوبی رہی۔

اُس نے ماسکو نیوز کے آفس فون کیا۔معلوم ہوا کہ وہ تو سات بجے چلا گیا تھا۔

وہ کُرسی پر بیٹھ گئی۔ھیشم نہ صرف اپنے کام سے متعلقہ معاملات بلکہ گھر اور دیگر سبھی امور میں انتہائی ذمہ دار اور فرض شناس تھا۔اتنے سالوں کی ازدواجی زندگی میں شاذونادرہی ایسا ہوا ہے۔

کیا بات ہے؟ اُس نے خود سے کہتے ہوئے سر پُشت سے ٹکایا تو جیسے تھکاوٹ آنکھوں میں نیند کی صورت اُتر آئی۔

کوئی دو بجے آنکھ کھلی۔ھیشم کہیں نہیں تھا۔اُس وقت جیسے خطرے کی گھنٹی بجی۔ اُس نے اپنے بے تکلّف دوستوں سے رابطہ کیا۔انہیں اس اُفتاد سے مطلع کیا۔اُن کا خیال تھا کہ تھوڑا سا انتظار کیا جائے۔

اگلے دن شام تک صورت واضح ہو چکی تھی۔پریس کانفرنس میں اُس نے کھلم کھلا حکومت پر الزام لگایا کہ اُس کے شوہر کو اغوا کرنے میں حکومت کا ہاتھ ہے۔اُس کے دلیر مارکسی ساتھیوں نے بڈھا، کھوسٹ، بیمار، پاگل یلسن کہتے ہوئے اُس کی پالیسیوں خاص طور پر یوکرائن، جارجیا، مالداویا اور چیچنیا پر زبردست تنقید کی۔

نعرے بھی بڑے بڑے تھے۔رُوسی فوج کی ذلت آمیز شکست کا باعث کون؟ یلسن۔چیچنیا کے مظلوم لوگوں کی ہلاکت کا باعث کون؟ یلسن جمہوریاؤں میں گڑ بڑ کروانے اور انہیں ذلّت آمیز معاہدوں پر مجبور کرنے والا کون؟ یلسن۔

جلوس نکلتے رہے، شور مچتا رہا۔ دن گذرتے رہے۔ مگر ھیثم کہاں تھا؟ کسی جیل کے خفیہ تہہ خانے میں، کسی قلعے کی تنگ و تاریک کوٹھری میں، سائبیریا کے برف زاروں میں یا آسمانوں پر۔ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ اُس کا سچا، کھرا، محبت کرنے والا، بے لوث ساتھی، اُس سے بچھڑ چکا تھا۔

مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ میں اُس سے اتنا پیار کرتی ہوں۔ وہ اپنی عزیز دوست نینا خروشیف سے کہتی۔

یہی وہ وقت تھا جب اُسے احساس ہوا کہ وہ بچے کے لئے کتنا متمنّی تھا۔ کبھی جو میں نے اُس کی اِس خواہش کو ذرا سی بھی اہمیت دی ہو۔ گھسیٹ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تب بھی کوئی خاص پرواہ نہیں کی۔ اور ستم ظریفی دیکھو کہ جب توجہ کی تو وہ نہیں تھا۔

کاش آج میرا بچہ ہوتا تو یوں میں اِس تنہائی کے جنگل میں کھڑی نہ ہوتی۔ کہیں زندگی سے بھری ہوئی اُس کی مسکراہٹ، اُس کی معصومیت، اُس کی دوسرا تھ مجھے اس کرب سے نکال لیا کرتی جس میں اس وقت میں گھری ہوئی ہوں۔

ایسے ہی پریشان کُن اور مضطرب دنوں میں ایک دن اُس نے اپنا بریف کیس پکڑا اور چیچنیا جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوگئی۔

وہ تو دنگ رہ گئی تھی ہزاروں میل دور بیٹھ کر تو تصویر کا صحیح رُخ سامنے ہی نہیں آتا۔

جنگ کے دنوں میں ھیثم یہاں آیا تھا اور اُس نے بتایا بھی تھا۔ پر یہ سب جو وہ اب دیکھ رہی تھی کس قدر ہولناک تھا۔ یوں بھی دل چھالوں سے زخمی تھا۔ اُوپر سے فطرت کی گود میں پلنے اور سانس لینے والا علاقہ جنگ کی ہولناکیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا پڑا تھا۔

جلی ہوئی عمارتیں، ٹوٹے ہوئے پُل، اُدھڑی پدھڑی سڑکیں، بموں کے تیر کے سہنے والے سکول۔

اُس کی آنکھوں سے ڈھیروں ڈھیر آنسو نکلتے رہے اور رُخساروں پر بہتے گئے۔

وہ جگہیں جہاں کبھی زندگی ہنستی مُسکراتی تھی۔ اب ویران تھیں۔ سرسبز چراگاہوں میں مست خرامیاں کرتے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، جانوروں کے گلّے، آسمان پر اُڑتے پرندوں کی ڈاریں، سب جانے کن دیسوں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ وہ پہاڑی لوگ جن کے بارے میں کوئی اُسے بتاتا تھا۔ یہ کارچائی ہیں، چرکسی ہیں؟ شکیری ہیں۔ وہ جو بڑا محبت کرنے والا، اپنے ماحول سے بُہت مختلف، دلبر سا ساتھی تھا۔ وہ بھی جانے کن دیسوں کی طرف اُڑ پُڑ گیا تھا۔ کیسے اُس کی آنکھیں بار بار بھیگتیں۔

پھر وہ چیچنیو اینگوش گئی۔ اُس گھر میں جہاں اُس نے چند دن گذارے تھے۔ وہ گھر جو اُس کا سُسرال تھا۔ یہاں کیا تھا؟ اُس گھر کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ ٹوٹا پڑا تھا۔ انگوروں کی بیلیں سُوکھی ہوئی تھیں۔ ملحقہ باغیچہ ویران تھا۔ بڑا سا صحن بھائیں بھائیں کرتا تھا۔

پھر وہ آگے بڑھی۔ اندر بڑے کمرے میں ایک پچاس پچپن سال کا مرد آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ ھیثم کے باپ کا عزیز تھا۔ ھیثم کا خاندان اپنے عزیزوں کے پاس داغستان چلا گیا تھا۔

وہ بے آواز قدموں سے اُن کمروں میں پھرتی رہی۔ جہاں کبھی اُس نے زندگی کو کُلبل کُلبل کرتے دیکھا تھا۔ جنگ کے المیے۔ اُس نے لمبی سانس بھری تھی۔

اُس نے قہوے کی پیالی پکڑی۔ گھونٹ بھرا اور اُس بوڑھے کو سُنا جو اُسے بتاتا تھا کہ رُوس نے بُہت ظلم کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ظلم کرتا آیا ہے۔ سوویت کے زمانوں سے اب تک۔ اُس نے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟ اُس نے ''جرنلسٹ'' کہہ کر بات ختم کر دی۔ اُس کے رشتے کی پہچان والا تو کوئی تھا ہی نہیں وہاں۔

اور جب وہ واپس آ رہی تھی وہ انتہائی دل شکستہ تھی۔ رُوس کو کیوں زوال آیا؟ اُس نے خود سے کہا۔

''یہاں انصاف نہیں۔ سپریم کورٹ کیوں نہیں اُس کا کھوج کر سکی۔''

وہ دُنیا میں نہیں۔ اُسے ختم کر دیا گیا ہے۔

زمانوں بعد وہ چرچ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے جب اُس نے اُس کے لئے کینڈل جلائی۔ رات کو وہ میرا پراسپکٹ کی مسجد میں گئی جہاں اُس کا نکاح ہوا تھا۔ نماز کے بعد وہ نمازیوں کے درمیان بیٹھی زار زار روتی رہی۔ اُس نے دُعا کی استدعا کی اور جب گھر واپس آتی تھی اُس نے کہا تھا۔

''چلو اچھا ہی ہے بچہ نہیں۔ وگرنہ تو اُسے بھی گولی کا نشانہ بنا دینا تھا۔''

اُس نے ھیٹم والے باب کو بند کیا۔ انصاف کی سر بلندی اور قانون کی عملداری والے باب کو کھولا۔ اور قلم کو مزید تیز کر لیا۔

وہ پہلے کیا کم تھی۔ پر اس سانحے نے بھڑکتی اور چنگاریاں چھوڑتی آگ بنا ڈالا تھا۔ قلم زہریلے ناگ جیسی پھنکاریں مارنے لگا تھا۔ اِس دوران اس پر ایک اور انکشاف بھی ہوا تھا کہ اُس کی ضرورت سے زیادہ حق گوئی و سچائی نے اُس کے دشمن زیادہ پیدا کئے ہوئے ہیں۔

اُس نے سر جھٹکا تھا اور اپنے آپ سے کہا تھا۔

اب اگر میں کہیں مزدوروں کی زیادتی محسوس کرتی ہوں تو اُس پر قلم نہ اُٹھاؤں تو یہ کہاں کا انصاف ہوا؟ کم از کم اینا پولٹکوسکایا سے تو یہ ممکن ہی نہیں۔

ایک سال، دو سال، تین، چار، پانچ، چھ سال سے بھی زیادہ کا وقت بیت گیا تھا۔

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں آس کا مُنا سا دیا پھر بھی اُس کے سینے میں جلتا تھا۔

اُس کا فون ٹیپ ہوتا۔ اُس کی تمام سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ یہ پیوٹن کا دور تھا اور نوجوان پیوٹن سب کا اُستاد تھا۔ پانچویں سال کے وسط میں اُسے پتہ چلا کہ وہ جنوبی سائبیریا کی اومسک جیل میں ہے۔

وہ بھاگی بھاگی اومسک گئی۔ اُس نے خفیہ رابطے کئے تو اُسے معلوم ہوا کہ یہاں تو اُسے کبھی لایا ہی نہیں گیا تھا۔

اُس کے سینے سے لمبی سی آہ نکلی تھی۔

''ایسے ہی بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ وہ دنیا میں نہیں ہے۔ حکومت کے اگر ذرائع ہیں تو ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ کسی چھوٹے کسی بڑے ذریعے نے کبھی خبر نہیں دی۔''

اور ایک دن جب وہ کسی سے ملنے منسک گئی واپسی پر کچھ دیر کے لئے قریبی پارک چلی گئی۔ ہریالیوں نیلے چمکدار آسمان کو دیکھتے ہوئے اُس نے بے اختیار ہی خود سے کہا تھا۔

''میں تو موسموں سے بھی بے نیاز ہو گئی ہوں۔ بہار کب آتی ہے؟ کب جاتی ہے؟ سردیاں، گرمیاں، اُن کے حُسن، اُن کی سختیاں آنکھ سے اوجھل ہیں۔ آج برچ کے پیڑوں پر پھوٹتی کونپلوں نے مجھے جیسے یاد دلایا ہے کہ برفوں میں بھیگے دن چلے گئے ہیں۔ دراصل زندگی میں خزاں ڈیرے ڈال لے تو موسموں کی رنگینی کب یاد رہتی ہے؟

گھر آئی۔ بیڈ روم میں گئی۔ پتہ نہیں کیا چاہیے تھا۔ اب وارڈ روب کا پٹ ہاتھوں میں تھامے کھڑی خود سے پُوچھتی تھی۔

''میں یہاں کیا لینے آئی تھی؟'' اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

وارڈ روب نے تو ایک نیا پراگا ڈال دیا تھا۔ اُس کے خانوں میں یادیں بکھری پڑی تھیں۔

ہینگروں میں ٹنگے کپڑے کسی کی چاہتوں کے رازدار تھے۔کونے میں دھرا جیولری بکس جس میں بہت سے مُلکُ اور محبتوں میں گندھے جذبات بند تھے۔اُس نے اُٹھایا۔ ڈھکن کھولا۔ہاتھ سے یونہی پھولا پھرولی کی۔بہت خوبصورت انگوٹھیاں جو شاید فرانس سے خریدی گئی تھیں۔

وہ بیٹھ گئی تھی۔اُس نے ایک ایک کرکے ساری انگوٹھیاں نکالیں اُنہیں باری باری اُنگلیوں میں پہنا۔ہاتھوں کو دیکھا۔کتنے بوڑھے لگ رہے تھے۔اُبھری ہوئی نیلی نیلی نسیں ہتھیلی کی چھت پر کس کثرت سے بکھری ہوئی تھیں۔ہاتھوں کا سارا حُسن کیسے گہنا گیا تھا۔ اپنی اِس سوچ پر اُسے تمسخرانہ سی ہنسی آئی۔ڈبے کو واپس رکھا۔

لاؤنج میں آئی۔اپنی میلز چیک کرنے بیٹھی۔

دفعتاً اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا سارا وجود گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلنے لگا ہے۔ مجھے ہیلوسینیشن (Hallucination) ہوا ہے۔میں اُس کے سحر میں تھی نا شاید۔ آنکھیں تپتے بے آب وگیاہ صحراؤں میں نخلستانوں کی متلاشی ہوں تو ایسے ہی ہوتا ہے تاحدِ نظر پھیلی چمکتی ریت دریا کا گمان دیتی ہے۔

اُس نے قریب پڑی تپائی پر رکھی بوتل کھول کر پانی کا بھرپور چھینٹا آنکھوں پر مارا۔اُنہیں خشک کیا۔پھر سکرین کو دیکھا۔پیغام روزِ روشن کی طرح تھا۔

ھیثم اپنے زندہ ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔

اُس نے میل کا جواب دیا۔یہم پر آنے کا وقت،دن لکھا اور اُٹھ گئی۔

کِسی کا مذاق،کوئی شرارت نہیں۔تردید پاس ہی تھی۔

وقت کا گذرنا جیسے قیامت ہوگیا۔جذبات کا بہاؤ بے قابو تھا۔

ناقابلِ یقین بات ہے۔وا ہے تکرار کرتے تھے۔

معجزہ ہے وہ زندہ ہے۔آنکھیں یقین دلاتی تھیں۔اگر آنسو بہتے تھے تو چند لمحوں کے لئے وجود میں خوشی و سرشاری کی لہریں بھی دوڑتی تھیں۔

وقت مقررہ پر اُس نے لیپ ٹاپ کھولا۔ہیڈ فون پہنا۔

آنسوؤں کی برسات میں چہرہ بھیگ رہا تھا۔اُس نے کسی چھوٹے بچے کی طرح ہتھیلی سے فوراً اُسے صاف کیا کہ جیسے ڈرتی ہو کسی انہونی سے۔سکرین پر کوئی تھا۔

اُس کا ھیثم۔آنکھیں جھپکیں۔کتنا وجیہہ تھا وہ سینکڑوں چھوڑ ہزاروں کے مجمع میں بھی نمایاں ہوتا۔ہیرے جیسی چمک والی موٹی خوبصورت آنکھیں اندر دھنسی نظر آتی تھیں۔وجود ہڈیوں کی مٹھ سا بنا ہوا تھا۔

''اینا''

محبت میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔پر اُس سے تو ھیثم کہا ہی نہ گیا۔گلے میں جیسے گولے پھنس گئے تھے۔

''اینا کھڑی ہو جاؤ۔مجھے دیکھنے دو''

وہ کھڑی ہوئی۔قدرے دُور چلی گئی۔

تم نے کیسے بدرنگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔تم کتنی کمزور ہو رہی ہو۔بند تو ٹوٹ گیا تھا۔

اور اینا کے نام کی پکار تھی۔وہ پکار جو زندگی تھی۔

اُسنے دیکھا تھا۔اُس کی نچلی پلکوں میں دو موتی اٹکے ہوئے تھے۔کمال ضبط تھا۔گالوں پر بہے نہیں تھے۔

اُس نے اِس خبر کو نینا اور عبدالرحمٰن سیاف کے ساتھ شیئر کیا اور طے پایا کہ خبر کو ابھی سینے میں کسی راز کی طرح دبا دو۔جب تک حکومتی سطح پر اس کا اعلان نہیں ہوتا۔

زندگی نے کیسے یکا یک ڈرامائی موڑ مڑا تھا۔دن رات کتنے حسین ہو گئے تھے۔وہ اُن مصائب اور مظالم کی تفصیل اُسے سناتا۔جس میں اُس نے چھ سال کا طویل عرصہ گذارا۔

''اینا تم یقین کرو گی ایسے بھی لوگ تھے جو ہم سے پیار کرتے تھے۔وہ ہمارے دیوانے تھے۔تمہارے بھی اور میرے بھی۔الیکٹرک شاک کے لئے لے کر جاتے تو وہاں شاکس لگانے کی بجائے گپیں لگاتے۔مجھے سکھاتے کہ مجھے کیسے Pretend کرنا ہے۔بُہت بڑا ڈرامہ رچانا پڑا تھا ہمارے اُن عاشقوں کو۔

اکثر وہ اُسے سمجھاتا۔

''اینا کچھ عرصے کے لئے اپنی سرگرمیاں روک دو۔رُوس سے نکلنے کی کوشش کرو۔بُہت تھک چکا ہوں۔کچھ وقت تمہارے ساتھ بُہت سکون سے گذارنا چاہتا ہوں۔مجھے اُمید ہے انگلینڈ میں سیاسی پناہ بُہت جلد مل جائے گی۔

بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔اُس کے جیل سے سے نکل بھاگنے کا راز کھل چکا تھا۔اوراس پر تحقیقات شروع ہو گئیں۔

اینا نے باہر جانے کے لئے درخواست دی۔اس درخواست کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔پیوٹن بھی اوّل درجے کا کایاں تھا۔اپنے مخالفوں کو چُن چُن کر قتل کروا رہا تھا۔

وہ تو اب اِس کوشش میں تھی کہ کب اُسے اجازت ملے اور وہ رُوس سے باہر جائے۔پر اِس اجازت کا ملنا فی الحال کوہ گراں تھا۔

ایسے ہی ماضی کو دیکھتے ہوئے،اس میں جھانکتے اور تھوڑا سا انتظار اور میری جان گنگناتے اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اُس کی پلکوں نے اُس کی آنکھوں پر پردے تان دیئے تھے۔

جاگی تو بھوک بھی تھی ۔تھوڑی سی تازگی بھی اور رات والے واقعے کی تلخی میں کمی بھی ۔کمرے میں تھوڑی دیر پھرتی رہی ۔گھڑی دیکھی ۔

خاصی نیند لی ہے میں نے ۔اُس نے اپنے آپ سے کہا۔چلو اچھا ہوا۔آج جانا بھی نہیں ۔

بالکونی میں آئی ۔دُھوپ کتنی روشن اور چمکدار تھی ۔دُنیا کاروبارِ حیات میں گُم سڑکوں پر رواں دواں تھی ۔

عجیب سے احساس سے وہ پھر دوچار ہوئی ۔کچن میں گئی ۔کافی بنائی ۔لاؤنج میں آئی ٹی وی آن کیا۔ایک نوعمر دلکش چہرے والی مغنیّہ پشکن کی ''زندگی کی شام'' گا رہی تھی ۔

کبھی آواز کی لہروں میں ملے دل کو سُرور
اور کبھی یوں ہی کسی بات پر اشکوں کی بوچھاڑ
کیا خبر جب ہو میری عمر کی ڈھلتی ہوئی شام
عشق دے جائے مسکراہٹ کا چھلکتا ہوا اِک جام
مسکراہٹ کا چھلکتا ہوا اک جام
اِک جام آواز خوبصورت تھی ٹی وی بند کیا۔

اِک جام اِک جام گنگناتے گنگناتے مگ ہاتھ میں پکڑے وہ پھر بالکونی میں آگئی ۔تھوڑی سی کافی باقی تھی ۔

پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔اُس نے تو چھوٹا سا سپ لے کر نتھری ہوئی آنکھوں سے اپنے سامنے والے حصّے پر تنے آسمان کو دیکھا تھا اور اپنے آپ سے صرف یہ پُوچھا تھا۔

''کب کب اُسے دیکھوں گی؟ اب بُہت جی چاہتا ہے ۔وہ اگر تھک گیا ہے تو سچی بات ہے میں بھی تھک گئی ہوں ۔''

وجود اِک ذرا لرزا تھا اُس کی مضطرب نظروں نے اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ بظاہر تو کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا پر سینے میں جیسے لوہے کی تپتی سلاخ اُتر گئی تھی۔

ہاتھ میں پکڑا مگ فرش پر گرا۔

اُس کے ٹوٹنے کی آواز تو کہیں اُس کے اپنے درد میں گم ہو گئی تھی۔ پر بالکونی کی چھوٹی سی جگہ پر عین اُس کے سامنے بکھری کرچیاں جیسے اُسکی آنکھوں میں اِس سوال کے ساتھ نمایاں ہوئی تھیں کہ کیا وہ بھی اب ان ہی کی طرح بکھر جائے گی۔

پھر وہ تیورا کر گری تھی۔ چوکھٹ پکڑنے کی کوشش کی۔ پر آنکھوں کے آگے گھور اندھیرا تھا اور ہاتھ جیسے بے جان سے ہو رہے تھے۔

سینے سے خون اُبل رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ جیسے اُس فوارے کے منہ پر رکھنے کی کوشش کی۔ پیشانی دروازے سے ٹکرائی تھی۔ ایک فوارہ وہاں سے اُبلا تھا۔ پل بھر کے لئے آنکھوں میں زندگی کی لو چمکی تھی اور نتھنے پھولے تھے۔ ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی ایک آواز نکلی تھی۔

ھیثم ۔۔۔ھیثم ۔۔۔۔میرا ۔۔۔اور تمہارا ۔۔۔نام ۔۔۔۔ہی زیب ۔۔۔نظر ہوگا۔

زیب ۔۔۔نظر ہوگا ۔۔۔۔وہ ۔۔۔تارا ۔۔۔۔وہ اِک تارا

اور گردن داہنی سمت لڑھک گئی تھی۔

آسمان چُپ رہا

بغداد جل رہا ہے جدّی۔ اس کے گلی کوچوں میں امریکی ٹینک توپیں ہلکائے کتوں کی طرح بھاگی پھرتی ہیں۔ پَل پَل اُڑتے ہیلی کاپٹر گردو غبار کے طوفان اُڑاتے اس کے چہرے کو دُھواں دُھواں کیے دے رہے ہیں۔ اعظمیہ کے خستہ حال گھر اپنے مکینوں کے ساتھ زمین بوس ہوگئے ہیں۔ بے گوروکفن لاشیں سڑکوں پر پڑی ہیں۔ المامون کے چھوٹے چھوٹے گھروں کے معصوم بچوں نے کہیں اپنی کھڑکیوں اپنی بالکونیوں سے جھانکا تو گولیوں نے اُنہیں بھون دیا۔ پانی نہیں ہے۔ جدّی آپ کا اور میرا بغداد کربلا بن گیا ہے۔

یہ اُنیس سالہ عبیر تھی۔ اپنے نام کی معنوی عکاس۔ آنکھیں جیسے دُکھ کے گہرے جذبات سے لدی پھندی مگر لہجے میں اندرونی کرب کا وہ رچاؤ جہاں شدت ایک عجیب اور بے نیاز سے احساس کی نمائندہ ہوجاتی ہے۔

تعاقب میں کھڑی پینتیس چھتیس سالہ دلکش خاتون نے سکارف سر سے اُتارتے ہوئے چھ فٹ 2 انچ کی کرمان کے کھجور کے درخت جیسی قامت والے سُرخ وسفید بوڑھے کہ جس کی گھنی مونچھوں میں اُس کا بالائی ہونٹ چھپ سا گیا تھا دیکھا اور قدرے غصے، قدرے ملال اور قدرے سرزنش گھلے لہجے میں بولی تھی۔

کیل کی طرح گڑی بیٹھی تھی کہ بغداد سے نہیں جانا۔جیسے یہ اگر نکلی تو فصیل شہر گر جائے گی اور بغداد ڈھے جائے گا۔

ایک حالات کی نزاکت اوپر سے اِس کا پاگل پن۔المنصور آرتھوپیڈک اسپتال جانے اور وہاں کام کرنے کی رَٹ۔باپ کی جان سولی پر چڑھی ہوئی۔یہ اُن کی ہر بات ہر خدشے کو گاجر مولی کی طرح کاٹے۔سٹڈی سرکل میں پڑھنے والی عورتوں پر تیخ پا کہ انہیں ایسے وقت میں گھر سے نکلنا چاہیے۔ہمیشہ آپ کی بات سُننے اور ماننے والی اب آپ کی حکم عدولی پر بھی تلی ہوئی۔

"جدّی میں نے تو گھر سے قدم بھی نہیں نکالا اور بغداد پھر بھی ڈھے گیا۔

بوڑھے عراقی کی آنکھوں میں نمی تیری۔اُس نے دو قدم آگے بڑھ کر پوتی کو بانہوں کے دائروں میں سمیٹ لیا۔اُس کے سکارف سے ڈھپے سر پر ہونٹ رکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

اپنی اولاد کے بچوں میں سے کسی کو تو مجھ پر جانا ہی تھا۔

پھر وہ سب وہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے یوں جیسے کسی میت کی رُخصتی سے فارغ ہوئے ہوں۔حویلی کے زمانوں پرانے خدّام بھی دلگیر سے اِس مشترکہ دُکھ میں شرکت کیلئے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ایک نے قہوے کی ٹرے تپائی پر رکھی۔اور جب وہ قہوہ پیتی تھی اُس نے اپنے دادا کو سُنا تھا۔

عراقی بڑے ہی بدقسمت ۔انہیں تُرکوں نے منہ نہ لگایا ۔بس اپنے حلوے مانڈے سے تعلق رکھا۔ان کے خزانوں میں ٹیکس جمع ہوتا رہے، رہے عراقی وہ جائیں جہنم میں ۔ہماری سادگی اور جاہلیت سے برطانیہ نے موجیں ماریں ۔انہوں نے اپنا اُلو سیدھا رکھااور ہمیں بھاڑ میں جھونکا ۔عرب قوم پرستی بھی نری فراڈ نکلی ۔کیمونسٹوں نے بڑے سبز باغ دکھائے ۔غریب اور ماٹھے لوگ ان کے خوش کن نعروں کی طرف بھاگے اور منہ کے بل گرے ۔موصل، کرکوک اور بصرہ خون میں نہایا تو جانے کہ یہ سب تو بس رولا گولا ہی ہے ۔

جمہوریت کیلئے کتنے پاپڑ بیلے ۔تو کہیں بس جھلک ہی نصیب ہوئی پھر یہ احمق آمر ہڈیوں جوڑوں میں بیٹھ گیا۔

اور اب بڑی دردناک بڑی شکست خوردہ سی ہنسی اُن کے لبوں پر آئی ۔دس سال کی اقتصادی پابندیاں ۔عراقی قوم کے خوشحال،مضبوط سماجی ڈھانچے پر کاری ضرب ۔مغرب کی دل لگی اور تماشے ۔

عراق کا سب سے بڑا دشمن تو اُس کا تیل ۔اب جنہیں نکال بیٹھے تھے وہ پھر آ گئے ہیں ۔فریڈم آف عراق کا جھنڈا لہراتے ۔تیل نکالنے اور غریب کو مارنے میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اُسے پوری کرنے ۔

اُس کی چھوٹی بہن نباء اپنی ماں ولدہ کے ساتھ اندر چلی گئی تھی ۔بس وہ وہاں بیٹھی رہی ۔اِس تنہائی، سناٹے اور سکون میں ڈوبے ماحول میں جہاں بہرحال اُس قیامت کا گزر نہیں تھا جو بغداد، بصرہ، ناصریہ، کربلا اور نجف میں برپا تھی ۔

اُس نے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر جال سا بنایا اور اپنے سر کی بیک کو اس پر ٹکاتے ہوئے فضا کو دیکھا۔

کچھ آنکھوں کے سامنے اُبھرا تھا۔تین سال پہلے کا ایک منظر اور جگہ بھی یہی تھی ۔ایسے ہی دن تھے اور یہ بھی کیسا اتفاق تھا کہ وقت بھی کم وبیش یہی تھا۔وہ منظروں کے حُسن میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی ۔

شام کے حُسن میں سلونا پن تھا۔سُورج دُور نظر آتے ٹیلوں سے ابھی خاصا اُوپر تھا اور دجلہ کے بہاؤ میں بہت دھیما پن تھا۔

عیربیٹھی تھی اب کھڑی ہوگئی کہ سفید براق مرغابیوں کی ایک ڈار اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے دھیرے دھیرے ایک ترتیب سے دجلے کے پانیوں پر اُتر رہی تھی۔

"اُف۔"

اُس نے بچوں جیسی معصوم کلکاری بھری ۔کیسا حسین منظر۔اُس کی آنکھوں میں منظر سے متعلق خوبصورتی ایک شعلے کی سی لپک والے احساس کے ساتھ باہر آئی تھی۔چند لمحوں تک وہ اِس سے محظوظ ہوتی رہی ۔

رُخ موڑا تو سامنے تاحدِ نظر پھیلے گندم اور جَو کے کھیتوں کا پھیلاؤ تھا۔ہریالی اور سنہرے پن کے گھلے مِلے رنگوں کے عکس دلفریب تھے ۔اُس کے دادا کو سال کے بارہ مہینوں میں سب سے اچھے یہی مارچ اور اوائل اپریل کے دِن لگتے تھے ۔دادا کا ایسا سمجھنا سوفیصد درست تھا کہ مئی جون میں تو دھرتی آگ اُگلنے لگ جاتی تھی ۔عیر نے درختوں کے جھنڈوں کو دیکھا اور ذرا دُور کھجور کے باغ پر بھی نظر ڈالی جن پر پھل ابھی پُتامُنا سا تھا۔

"ہزاروں بار کے دیکھے ہوئے اِن منظروں میں ہر دفعہ ہی کچھ نئی تازگی کچھ نیا حُسن محسوس ہوتا ہے ۔اُس نے خود سے کہا تھا۔شاید نظروں کے زاویوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے یا درمیان میں تھوڑا سا وقت گزر جانے پر جب اعادہ ہوتا ہے تو انوکھی سی سرشاری کا احساس جاگتا ہے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی وہاں آ گئی تھی جہاں گنجے سَر والا ایک بوڑھا کاہی رنگی توپ میں ملبوس آنکھوں پر چشمہ لگائے حُقّہ پیتے کچھ پڑھتا تھا۔

عبیر دادا کے قریب آئی۔ حُقّے کی لمبی نال جو زمین پر بکھر گئی تھی سمیٹ کر تپائی پر رکھی اور دادا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جدّی اتنی تمبا کو پینا ٹھیک نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے مُنہ سے پائپ نہیں چھوٹتا۔

وہ ہنسا۔ اب تم ان پاس بھرے دِنوں میں اِسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو۔ چلو نبیذ پر تمہاری پابندی میں نے مان لی ہے۔

عینک کے موٹے شیشوں سے دادا نے پوتی کو دیکھا تھا۔

سیاہ اور گلابی پھولوں والے لونگ سکرٹ، کندھوں پر جھولتے گھنے سیاہ بالوں میں عبیر کا چہرہ جیسے چاند کی طرح دمکتا تھا۔ وہ میڈیکل کی ذہین ترین طلبہ السریۃ الثانیہ میں جب بھی آتی۔ دادا سے لمبی لمبی نشستوں کے دوران بحث مباحثوں میں ضرور اُلجھتی۔

عبیر کسی کو قہوے کیلئے کہتا تھا۔

ابھی تو ایک لفظ بھی اُس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا تھا۔ جب اُس مصطفیٰ البرزانی نے دبیز شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی نگاہوں میں شریری مسکراہٹ سے اُسے دیکھا۔ اُنکے ہونٹوں پر ان الفاظ کی مٹھاس تھی۔

"جدّی یہ اتنا قہوہ پینا آپ کیلئے مضر ہے۔ نہیں کہنا۔ ہرگز نہیں کہنا۔"

عبیر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کیسی ہنسی تھی۔ جیسے ساری فضا نغمہ بار ہوگئی ہو۔ بوڑھے نے اُس کی پُشت کو محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا جس پر بکھرے ہوئے گھنے سیاہ بال اُس کے چلنے کے ساتھ ہلکورے کھاتے تھے۔

انہیں نوکر کے ہاتھ قہوہ بھجوا کر اور اپنی ماں سے رات کے کھانے پر کیا مِلے گا جیسے سوال پوچھتی" کچھ نہیں "فلافل کا ڈنر ہوگا۔کیوں؟ بحث کرتی۔سکینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔جیسے جواب سُنتی تھوڑی سی جز بز ہوتی پھر باہر آ گئی تھی۔اندر تو اُس کا دل ہی نہیں لگتا تھا۔

جب وہ اپنے جدّی کے باغیچے میں آئی اُن کے پاس کچھ لوگ تھے۔پَل بھر کیلئے وہ ساکت کھڑی ہوئی۔خود سے پوچھا؟اور سوال بھی کیا۔جانے کون ہیں؟ آگے جانا مناسب ہوگا یا نہیں۔بالعموم اپنے دادا کے دوستوں سے وہ بے تکلف تھی۔

اُسے رُکے دیکھ کر جدّی کی آواز اُن کے لہجے کی شگفتگی، اُس میں جھلکتی سرشاری جیسے اُس سے مخاطب ہوئی تھی۔رُک کیوں گئی ہو؟ آگے آؤ۔دیکھو تو سہی آج کون آیا ہے؟

مہمانوں کی پُشت اس کی طرف تھی۔دو چہرے اور چار آنکھیں۔ایک بوڑھا دوسرا جوان۔اپنی اپنی عمروں کے حساب سے دونوں دلکش۔نظروں میں شوق و اشتیاق کی موجیں لیئے کھڑے ہو گئے تھے۔بوڑھے نے آگے بڑھ کر اُس کو بانہوں میں سمیٹا۔اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا پہچانو تو بھلا میں کون ہوں؟

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

میں تو پہچان گئی ہوں۔امتحان تو آپ کا ہے۔بتایئے ذرا میں کون ہوں؟

مخاطب کا اونچا زوردار قہقہہ اُس خاموش فضا میں گونجا۔

تو اگر پہچان جاؤں کچھ انعام و نعام بھی ہوگا۔

پھر مسکراتے، اُس کی آنکھوں میں جھانکتے، قامت کو ذرا سی خمیدہ کرتے ہوئے بولے۔

"بھئی آپ ہماری بہت پیاری عُمیر ہیں۔"

جدّی کی آواز میں جو چہکار تھی ۔وہ تو بن بولے ہی بتائے دے رہی تھی ۔اُن کے پُرانے اور نئے البموں کے پلندوں میں شاید ہی کوئی تصویر اُن کے بغیر ہو۔

سرما کی راتوں میں فائل میں سنبھالے گئے پرانے اور نئے خطوط کو پڑھنا، نئی تصاویر میں انہیں دیکھنا، وہ بھلا اجنبی کب تھے؟ احمد بارزنجی، سلمانیہ کا سُنّی گُرد جو اس کے شیعہ دادا کا یار غار، جمہوریت کی جدوجہد میں اس کا پَل پَل کا ساتھی، کٹر سوشلسٹ، خوبصورت اور انقلابی شاعر، صدام اور بعث پارٹی کے عتاب سے جانے بچ کیسے گیا؟ مرنے میں کسر تو کوئی باقی نہ تھی، جیل سے بھاگ گیا تھا انگلینڈ۔

لڑکا پوتا اور پہلی بیوی سے تھا۔ ڈاکٹر تھا۔ بغداد میں ہی بڑھا پلا اور پڑھا۔ کوئی سات سال سے امریکہ میں مقیم تھا۔ پہلے سپیشلائزیشن کے سلسلے میں۔ اب Voices in the Wilderness اور دیگر کئی تنظیموں میں شامل ہو کر عراق پر عائد پابندیوں کے خلاف تحریکیں چلاتا، فنڈ اکٹھے کرتا، ادویات کی ممکن فراہمی یقینی بناتا اور غیر مُلکیوں کو اسپتالوں کے دورے کرواتا۔ ابھی وہ بصرہ سے آرہا تھا۔ اُس نے بصرہ کے اسپتالوں کی خوفناک حالت زار، بچوں کی خطرناک بیماریوں جن میں سر فہرست کینسر، لیکیومیا Leukemia، ڈائریا، ہیپاٹائٹس اور اعضاء کے ٹیڑھے پن کی خوفناک منظر کشی کی تھی۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ عمیر کھڑی تھی سُنتی تھی پھر ڈاکٹر مسعود بارزنجی کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بیٹھی اور بولی۔

"آپ چار سالوں سے مسلسل عراق میں آجا رہے ہیں۔ اف میرے خدایا۔ آپ پہلے کیوں نہیں میرے جدی سے ملنے آئے۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کرتی۔ بہت سی ایسی جگہوں پر آپ کو لے کر جاتی جہاں کے لوگوں اور بچوں کو اِس تعاون کی شدید ضرورت

ہے۔

ملاّ احمد بارزنجی نے عبیر کو دیکھا تھا۔ کس انہماک سے وہ ڈاکٹر مسعود کی طرف متوجہ تھی۔ بیتابی ،شتابی، دُکھ بھرے جذبات کا چہرے پر پھیلاؤ ،کتنے رنگ تھے وہاں۔قدرے دھیمے لہجے میں وہ دوست سے مخاطب ہوئے۔

"مصطفےٰ ہدیٰ سے تمہارے بے پایاں عشق کا عبیر کی صورت یہ انعام بہت خوبصورت ہے۔

"بہت جذباتی، منہ پھٹ، بے باک اور عراق کی محبت میں گُھڑی ہوئی ہے یہ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔کل ہی بغداد سے آئی ہے۔رات اس بات پر ہی تکرار کرتی رہی۔

جذ ی میرا تو جی چاہتا ہے شہدا برج پر کھڑے ہو کر صدام کو آواز دوں اور پوچھوں کہ اُس بدمعاش امریکہ کی حرامزدگیوں کا رونا تو اپنی جگہ۔صرف اتنا بتاؤ کہ تمہاری اور تمہارے حکمران ٹولے پر اُس پٹھو تنظیم نام جس کا یواین او ہے کی عائد کردہ پابندیوں کا کیوں اثر نہیں۔تمہارے بچے اِن بیماریوں سے کیوں نہیں مر رہے ہیں؟ تمہاری عورتیں راشن کیلئے قطاروں میں کیوں نہیں کھڑی ہوتی ہیں؟ تمہارے گھروں میں لوڈشیڈنگ کیوں نہیں؟ تمہارا پینے کا پانی کیوں گدلا نہیں؟

"جواب دو صدام۔"

امریکہ ظالم ہے تو تم اُس سے بھی بڑے ظالم ہو جو اپنی کرسی کا سودا معصوم بچوں کی بیماریوں اور موت سے کر رہے ہو۔تم امریکہ کے آلہ کار ہو۔

میں نے ہاتھ جوڑے اور ساتھ میں ڈپٹا بھی۔مگر زنجی اس میں ایک سچی انقلابی روح ہے میں کیا کروں؟

ابھی باتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا جب وہاں دو عورتیں ایک بچے کے ساتھ آئیں۔

وہ یہیں اُس چھوٹے سے باغیچے میں ہی آ گئیں۔ کوئی فرلانگ پرے سریئیڈ الثانیہ کے گاؤں سے تھیں۔ بچہ بیمار تھا۔شفا خانے میں دوائی کے نام پر سر درد کی گولی بھی نہ تھی ۔حالت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے وہ یہاں آئی تھیں کہ اس گھر کا سربراہ اپنے وسیع تعلقات اور مالی وسائل سے کبھی اُردن، کبھی شام اور کبھی انگلینڈ سے دوائیں منگوا کر رکھتا تھا۔شفا خانے کو بھی فراہم کرتا اور گھر میں بھی ہوتیں۔

عمیرا اور ڈاکٹر فوراً متوجہ ہو گئے۔

نمونیے کا شدید اٹیک تھا۔سانس لینے میں شدید دشواری تھی ۔ چھاتی کھڑ کھڑ کرتی تھی ۔آکسیجن کی اشد ضرورت تھی ۔مگر اسپتال میں آکسیجن چھوڑ دوائی تک نہیں تھی ۔

دوائیاں موجود تھیں۔انہی میں سے مناسب کا انتخاب ہوا اور دی گئیں ۔دونوں عورتوں نے شکریہ ادا کیا بچہ کندھے سے لگایا اور رُخصت چاہی۔

کیسے آئی تھیں۔

کشتی سے۔

کیا وہ انتظار میں ہو گی۔

نہیں ۔اُسے آگے جانا تھا۔

مصطفےٰ البرزانی نے ملازم بُلایا اور انہیں پار چھوڑ آنے کا کہا۔

اُن کا یہ گھر گاؤں سے کوئی نصف میل پر دجلہ کے بائیں کنارے پر تھا۔بغداد موصل روڈ پر چڑھنے کیلئے زمینی راستہ تھا مگر دجلہ کے پار گاؤں جانے کیلئے انہیں کشتی استعمال کرنا پڑتی تھی۔

ایسے پریشان حال لوگوں کے جانے کے بعد عمیرہ ہمیشہ افسردگی اور دل شکستگی کی دبیز تہہ میں ڈوب جاتی تھی ۔ہمیشہ ایسا ہوتا جب وہ بیماروں کو دوائیاں نہ ملنے کے باعث

مرتے دیکھتی تو پہروں کڑھتی۔

آج یقیناً یہاں ڈاکٹر مسعود بارزنجی کی موجودگی تھی جس نے بچے کو انتہائی توجہ سے دیکھا اور فوری بہترین طبی امداد دی جو اُس کے میڈیکل کٹ بیگ میں موجود تھیں۔خاتون کے گھر کا پتہ عبیر نے سمجھا تھا اور رات کو وہاں چکر لگانے اور بچے کو دیکھنے کا پروگرام فائنل کیا تھا۔

کوئی معجزہ ہی بچے کو بچا سکتا تھا اور میرا خیال ہے ڈاکٹر مسعود کی صورت قدرت یہ معجزہ یہاں بھیج چکی ہے۔

اُس نے اُن کے جانے کے بعد احمد بارزنجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

اُس نے دُور سُورج کو دیکھا تھا۔سُورج کی تیزی شوخی اور جولانی سب کہیں غائب تھیں۔زوال کی کمزوری غالب تھی۔

اور جب سُورج غروب ہو رہا تھا وہ سب کھڑے ہوئے۔گھر کے اندر جاتے ہوئے عبیر کے لبوں پر اُس باغی شاعر نظار قبانی کی نظم اُبھری تھی جو بے اختیار اُس کے لبوں سے پھسل کر اونچی آواز میں فضا میں پھیل گئی تھی۔اور جیسے دونوں بوڑھوں کے ساتھ ساتھ اُس نوجوان نے بھی سَر جُھکائے آہستہ آہستہ چلتے چلتے سُنا تھا۔اور سراہا تھا۔

ہمیں جوش و جذبے سے بھرپور ایک نسل کی ضرورت ہے
جو آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے
جو تاریخ کو ہلا دے
ہمیں ایک ایسی نسل کی ضرورت ہے
جو غلطیاں کوتاہیاں درگزر نہ کرے
جو گھٹنوں کے بَل نہ جُھکے

ہمیں ضرورت ہے جنات کی ایک نسل کی

پھر وہ سب اُس پندرہ فٹ بلند دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اس وسیع وعریض گھر کی بلند و بالا فصیلیں مصطفٰے البرزانی کے باپ کے زمانے میں مٹی کی تھیں۔ اس کے زمانے تک ایسی ہی رہیں۔ بیٹوں کے دَور میں پختہ پتھروں کی بن گئیں۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک طرف نیلے گرینائٹ کا حوض تھا۔ بیچ میں وسیع لان جس کے چہار جانب درخت تھے۔ آگے برآمدے اور برآمدوں کی پُشت پر کمروں کی قطاریں تھیں۔

اِس وقت لوڈشیڈنگ تھی۔ برآمدوں میں جلتی مشعلیں ماحول کو درجہ خوابناک سا بنا رہی تھیں۔

وہ سب مصطفٰے البرزانی کے کمرے میں آگئے تھے۔ کمرے کا نصف حصّہ چبوترہ نما سٹیج جیسی صورت لیے تُرکی کے شہر ازمیر کے خاص قالینوں سے سجا تھا۔ دیواروں پر پُرانے زمانے کی بندوقیں لٹکتی تھیں۔ عبیر دادا کی ہدایت پر رات کے کھانے کا کہنے چلی گئی۔

رات کا کھانا پُر تکلّف تھا۔ گھر کے سب افراد بیٹھے۔ ملقوبہ کی ڈش بہت پسند کی گئی۔

عبیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

مصطفٰے جدّی آپ کی وجہ سے ہمیں یہ شاندار سا کھانا ملا۔ وگرنہ تو امّو نے فلافل پر لڑخانا تھا آج۔ قہوے کا دَور چلا اور ساتھ پُرانی یادوں کا بھی۔ وہ خط جو احمد بارزنجی نے اپنے اِس جگری یار کو اُن دنوں لکھے جب وہ سب عراق کو جمہوریہ بنانے کی جدوجہد میں تن من دھن سے سرگرم عمل تھے۔

عبیر نے ہنستے ہوئے فائل میں سے ایک خط نکالا اور احمد بارزنجی کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وقت نے ماضی میں چھلانگ ماری۔ 1958ء کے رگوں میں لہو اُبالنے والے دن

یاد آئے تو مسکراہٹ نہ صرف ہونٹوں پر اُبھری بلکہ چہرہ بھی اس میں نہا گیا۔

"مصطفےٰ البرزانی اب جتنے بھی امکانات سامنے ہیں خدا گواہ ہے اُن میں سے کِسی ایک پر بھی میرا دِل نہیں ٹھکتا۔ مجھے بتاؤ تو سہی آخر تم السریہ ثانیہ کر کیا رہے ہو؟ بغداد کا ہر چڑھتا دِن جس اضطراب، بے کلی، آس، اُمید، مایوسی اور گھٹن کا پل پل شکار ہو رہا ہے وہ کب تم سے پوشیدہ ہے؟ پھر کیا تمہارے پاؤں تلے کوئی میگنٹ بار آ گئی ہے جس نے تمہیں چپکا لیا ہے۔

نیا مہمان گھر میں آنے والا ہے۔ بیوی کا گوڈا تھامے بیٹھے ہو کہ اب بچہ جنوا کر ہی اٹھو گے۔ کہنے کو ابھی خیر النساء سے تمہیں ذرا الفت نہیں۔ ہوتی تو جانے کیا کرتے۔ ایک خیال تمہارے لالچی باپ کی طرف بھی جاتا ہے۔ جو شاید اِن دِنوں سوچوں کی گھمن گھیریوں میں بھی ہو کہ موقع و مفاد پرست اِس قبائلی سردار نے برطانوی لارڈز کی مٹھی چاپیوں اور خوشامدیوں سے جو زمین سمیٹی ہوئی ہے اب آزادیٔ عراق کے کسی انقلاب کے ہاتھوں چھن نہ جائے۔ ایسے میں اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے اُس کی دلجوئی کرنا تمہارے لیے بہت اہم تو ہے نا۔

بصرہ سے محمد الرکابی آیا ہے بہت ساری خبروں کے ساتھ۔ بعث پارٹی میں افلاق شافی کا حُبِ ناصر گروپ اِن دِنوں ناصر کی محبت میں کچھ زیادہ جذباتی ہو رہا ہے۔ کل "ہراس الاستقال" پر چھاپہ پڑا۔ حُریہ میں بشار کے گھر سب اکٹھے تھے۔ پندرہ کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

رات المغرب سٹریٹ کے اپنے اُسی کیفے میں محمد الرکابی کے اعزاز میں کھانا تھا۔ محمد العبیدی کی نئی نظم نے بڑا اسماں باندھا۔

اب ازراہِ مہربانی اِسے خط تو ہرگز نہ سمجھنا بس تار جاننا۔ بھاگتے بھاگتے چلے آؤ۔

دونوں بوڑھوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔آنکھوں کے گوشے نم تھے۔خط اب مسعود بارزنجی کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

اُس خط نے بھی بہت لطف دیا جو مصطفٰے البرزانی کے پھوپھی زاد ابراہیم علاوی کا تھا۔بڑا بغض رکھتا تھا احمد بارزنجی سے۔ہمیشہ ہی اُسے اُکساتا رہتا تھا۔

ارے سُنّی کُرد ہے۔سمجھو اُسے۔یہ کُرد تو نرے فصلی بٹیرے ہیں۔عراق سے کب مخلص ہیں؟ کُردستان بنانا چاہتے ہیں۔امریکہ، برطانیہ کے ایجنٹ اور اُن کے پٹھو۔ہمہ وقت مار دھاڑ پر مائل۔تُرکوں نے انہیں خوب رگیدا ہے پر یہ کمبخت پھر بھی باز نہیں آتے۔اپنی ٹانگ دکھری رکھنے کے شوق میں گھائل ہوئے جاتے ہیں۔

بہت سی یادیں چھم چھم کرتی دماغ کے گوشوں سے باہر نکل آئی تھیں۔

خلیفہ سٹریٹ کے قہوہ کیفوں میں بیٹھ کر دُھواں دھار بولتے۔الجواہری کی شاعری سُنتے۔کبھی مظفر النواب کو پڑھتے۔شاہ فیصل بن غازی اور ساتھ نور السید اور جعفر عسکری کے بخیے اُدھیڑتے۔حکومت کے چھاپے مارنے پر مار دھاڑ کرتے بھاگتے۔کبھی دمشق کبھی قاہرہ چھپتے پھرتے۔جمال عبدالناصر کے نعرے لگاتے لگاتے انقلاب آ گیا۔گلی کوچوں میں نوری السعید کی لاش کے ٹکڑے بکھر گئے۔عراق جمہوریا بنا۔پر کہاں استقامت تھی اِس مُلک کے مقدر میں؟عبدالکریم قاسم کا زمانہ۔بغاوتوں،سازشوں، کیمونسٹوں کے وار۔بعث پارٹی کی چالاکیاں،عرب قوم پرستوں کے مفادات، بیچارے لوگ امن کو ترستے خون میں نہاتے رہے۔عبدالسلام عارف، ڈاکٹر عبدالرحمٰن البزاز پھر جون 1966 کو بغداد کی گلیوں میں ٹینک توپوں کا گشت۔

صدام نے کیمونسٹ سوچ پر توپیں چڑھائیں تو احمد بارزنجی جیسے لوگ عقوبت خانوں میں پھینک دیئے گئے۔سوختوں سے باہر نکلا تو مُلک بدر ہونے میں عافیت

جانی ۔ پہلے اٹلی پھر انگلینڈ ۔ باہر کے مُلکوں سے آئے ہوئے اُس کے وقتاً فوقتاً ڈھیر سارے خطوط فائل میں کس درجہ سلیقے سے ترتیب وار لگے ہوئے تھے ۔

ابھی تازہ لائے گئے قہوے کی چسکی بھرتے ہوئے وہ بولی تھی ۔

آخر جدّی آپ جب جدوجہد آزادی کے دِنوں کی یادیں مجھے سُناتے ہیں تو بتایئے اُس لڑکی کا قصہ کیوں گول کر جاتے ہیں جو آپ کی جدوجہد کے ہر دِن کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی انداز میں سامنے آتی ہے ۔

مصطفٰے البرزانی نے رسان سے کہا ۔

میری بچی میری عمیر عراق کو جمہوریہ بنانے کی جدوجہد میں کوئی ایک لڑکی تھوڑی تھی بہت ساری تھیں ۔

دونوں مسکرائے تھے ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا ۔

احمد بارزنجی نے ستائش بھری نگاہیں عمیر کے رخِ روشن سے اٹھا کر دوست کے چہرے پر ٹکاتے ہوئے کہا ۔

یقیناً بہت کچھ یاد آیا ہوگا ۔"

بہت کچھ بھولتا کب ہے؟ رگِ جان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے ۔"

ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ جو ماضی کی دلکشی اور شکستگی دونوں کو سنبھالے ہوئی تھی ۔

بلوری شیشے میں سونے جیسے رنگ میں گھلے قہوے کے گھونٹ نے لبوں کو کیا چھوا کہ پَل نہیں لگا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا تھا جہاں پہنچنے کی اُسے ہمیشہ بڑی خواہش رہتی تھی ۔ چھوٹے سے کپ کے اُفقی کنارے سے اپنے سامنے کی دیوار کے منظر کو اُس نے یوں گہری نظروں سے دیکھا تھا کہ سین تو جیسے وہاں پینٹ ہوا پڑا تھا ۔

اُس شام بھی اُن سب کا ٹولا المغرب سٹریٹ کے ایک کیفے میں موجود تھا ۔ عجب

باشا کے علاقے میں دجلہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں المغرب سٹریٹ پر اس قہوہ کیفے کا مالک خود پکا کیمونسٹ اور انقلابی تھا۔

اُس شام بھی اُس نے قہوے کی گلاسی کو ابھی مُنہ لگایا ہی تھا جب قہوے خانے کا دروازہ دھڑ سے کھلا ۔جیسے ہوا کا ایک لطیف، خوشگوار جھونکا رگ و پے میں لطیف سی سرشاری دوڑاتا اندر آئے ۔بس ایسے ہی وہ داخل ہوئی تھی ۔پاؤں تک پھولدار قرمزی رنگ کا لونگ سکرٹ، گلے میں خوبصورت موٹے پتھروں کا ہار جو اُس کی ناف کو چھوتا تھا۔سیاہ پھولوں والا سکارف سر پر اوڑھے تھی ۔تعاقب میں ایسے ہی حُلیے والی ایک اور لڑکی تھی۔

چہرہ تو ایسا تھا جیسے بہار کے اولین دِنوں میں کھلنے والا کوئی پھول ہو۔قہوہ جس کی چُسکی بھرنے جا رہا تھا وہ تو ہاتھوں میں ہی جھولتا رہ گیا تھا۔پٹر پٹر اُسے دیکھتا تھا۔وہاں موجود کچھ سینئر لڑکے کھڑے ہو کر اُس کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھے تھے۔اُس نے ابو الہیثم سے پوچھا تھا۔اور پتہ چلا تھا کہ دونوں لڑکیاں کُرد ی اور اُمّ زینب ترکمانی ہیں ۔سلیمانیہ سے پانچ سات کلومیٹر پر سرچینار Sarchinar گاؤں سے تعلق ہے ۔مگر حال انگلینڈ سے آئی ہیں ۔عرصہ دس سال سے اپنے چچا کے پاس وہاں مقیم تھیں ۔

اُس نے بیٹھنے کے ساتھ ہی لڑکوں پر جو لعن طعن اور پھٹکار برسائی وہ سٹپٹا سا گیا۔

"ذرا پولیس کا چھاپہ پڑا اور تم لوگ بھاگ گئے ۔کمبختو کچھ اپنا دم خم دکھاؤ گے یا یونہی عورتوں کی طرح بھاگتے پھرو گے۔نوری السید نے ہماری بوٹیاں تک برطانیہ کو کھلا دینی ہیں ۔بغداد پیکٹ دیکھ لیا ہے نا۔پس تو بہتر نہیں کہ جان کسی کاز Cause کیلئے جائے ۔

لڑکے سر نہوڑے بیٹھے اُسے سُنتے تھے ۔اگلے دِن کے احتجاجی جلوس کی تفصیل اُس نے بتائی ۔اور جیسے آئی تھی ویسے ہی اٹھ کر چلی گئی اور احمد مصطفےٰ البرزانی کو محسوس ہوا تھا جیسے شام کے سارے چراغ گُل ہو گئے ہیں ۔

اُن دنوں بغداد کے گلی کوچوں میں حشر ہوا پڑا تھا۔ اعظمیہ اور کرخ کے قدیمی محلے جن کے گلی کوچوں میں مرد کیا عورتیں اور چھوٹے بچے بھی نعرے لہراتے تھے۔ سامراجیو عراق چھوڑ دو۔ روٹی مفت۔ مہنگائی ختم۔

ہجوم کسی طرح کنٹرول میں نہیں آ تا تھا۔ مامون پُل کے آر پار لوگوں کا ہجوم تھا۔ انتظامیہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ ایک دوسرے کو ملیں اور یوں ہجوم جلوس کی صورت اختیار کر لے۔ بکتر بند گاڑیوں اور مشین گنوں کے مُنہ کھُل گئے تھے۔ نوجوان لڑکے کٹ کٹ کر دجلہ میں گرنے لگے۔ ہُدیٰ نے پرچم بہن کو پکڑایا۔ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چودہ پندرہ سالہ منتہا نے پرچم پکڑا اور چلی۔ ہُدیٰ چلی۔ مصطفےٰ البرزانی نے احمد بارزنجی کا ہاتھ تھاما بھاگے اور دونوں بہنوں کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور لڑکے بھی داہیں باہیں چلنے لگے۔

ہُدیٰ تو جیسے اُس کی روح میں اُتر گئی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہ رہا کہ وہ کوئی میٹنگ کوئی جلسہ جلوس مس کرتا جس میں ہُدیٰ شامل ہوتی۔ ہُدیٰ کی بہن اور وہ بچ گئے پر ہُدیٰ خون میں نہا گئی۔

سالوں بعد آنے والے اِس مہمان کو تین دن کے قیام پر ہزاروں منتوں سے روکا گیا۔ عمیر اور ڈاکٹر مسعود نے گاؤں کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے درمیان وقت کا زیادہ حصّہ گزارا۔ راتوں کو صدام ایران عراق اور خلیجی جنگ جیسے موضوع زیر بحث آئے۔ عمیر کا انداز بہت جذباتی ہوتا۔

یہ امریکہ، یہ یو این او، یہ سلامتی کونسل کتنے بڑے فراڈ، کتنے بڑے چیٹرز cheaters۔ صدام اُنہیں قبول نہیں۔ صدام کو مارنا چاہتے ہیں۔ بھئی مار دو

اُسے خلیجی جنگ کا مجرم ہے ۔ بات نہیں سُنتا ہے ۔ پر غریب عوام کو کس بات کی سزا؟ کمال ہے ۔ وہ گلاس پائی اتنی پچو چی سی تھی کہ صدام کی باتوں کو سمجھی نہیں اور صدام ایسا جیالا اور بہادر کہ وہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کے بغیر اتنا بڑا اقدم اُٹھاتا ۔ مانا کہ کویت عراق کا حصّہ ہے اور یہ سب بد معاشیاں برطانیہ کی تھیں کہ جس نے کویت کے ٹکڑے کو علیحدہ کر کے اُسے صبا خاندان کو دان کرتے ہوئے وہاں کے شیخوں کی دولت سے اپنے بینک کالے کر لیے ۔

ہاں البتہ بڑوں کی باتوں میں تاسف اور دُکھ کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی تصویر بھی دیکھتی ۔ ایرانی انقلاب سے خائف امریکہ، عراق کی بڑھتی فوجی طاقت سے خائف اسرائیل نے دونوں کو لڑا دیا ۔ عراق کو اسلحے کی فراہمی امریکہ نے کی اور ایران کو اسرائیل نے ۔ سیاست کے عیارانہ انداز ۔

رہا کویت تو وہ ہمیشہ سے عراق کا حصّہ تھا ۔ چلو یہ احمق صدام ذرا موقع محل دیکھ لیتا ۔ اگر حملہ کر دیا تھا تو وہاں انتخابات کروا دیتا ۔ کویتی تو صبا خاندان سے ناکوں ناک آئے ہوئے تھے ۔ مگر کرواتا کیسے؟ اپنے لوگوں کو تو نکیل ڈالی ہوئی تھی ۔ زبانوں پر تالے لگوا رکھے تھے ۔

اب رہی یہ عراقی قوم پر پابندیاں تو یہ بھی ان کی پلاننگ کا ایک حصّہ ہے ۔ احمد یار زنجی بیرون مُلک ہونے کی وجہ سے حالات کی باریکیوں سے زیادہ آگاہ اور امریکہ کی ریشہ دوانیوں کے ہتھکنڈوں سے زیادہ واقف تھے ۔ عمیر حیران تھی جب وہ کہتے تھے کہ امریکی دراصل صدام کو مظبوط کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ انہیں صدام سے محبت ہے ۔ دراصل خطے میں انہیں صدام کے علاوہ کوئی اور موزوں بندہ نظر نہیں آتا ۔ کُردوں کو جس انداز میں رگڑا دیا گیا ۔ اُنکے گاؤں زہریلی گیس سے جس انداز میں بھسم ہوئے اُس کے ذکر سے ہڈیوں میں خون جمتا ہے ۔ جنوب کے شیعاؤں کا جو حال ہوا ۔ وہ بھی ظلم کی بدترین شکل تھا ۔

اور جب انہوں نے یہ کہا۔ اب ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری اور اُن کے پھیلاؤ کا شور وغوغا سب فضول اور اوچھی باتیں۔ اپنی انہی باتوں کے گھوڑے پر چڑھ کر ایک دن وہ یہاں آجائے گا۔

اُس نے سہم کر یہ سُنا۔ اور گھائل سی آواز میں بولی۔

مصطفےٰ جدی امریکہ بغداد پر قابض ہو جائے گا۔

خدا نہ کرے مگر حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں وہ حوصلہ افزا نہیں۔

اور وقت رُخصت مسعود کے تین چار وعدے تھے بغداد اُن کے گھر آنے، اس کے ساتھ متاثرہ خاندانوں سے ملنے، اُن کے بچوں کے چیک اپ اور علاج کے سلسلے۔

وقت رُخصت احمد بارزنجی نے اُس کا ماتھا چوما اور کہا تھا کاش عبیر جیسی میری کوئی پوتی یا نواسی ہوتی۔ اور اُس نے پَل نہیں لگایا تھا بولنے میں۔

ایسا کیوں کہا آپ نے؟

"آپ تو ہمیشہ مجھے اپنے جدّی ہی لگے ہیں کہ آپ کے بارے میں سُنتی تھی اور اپنے متعلق آپ کا لکھا ہوا پڑھتی تھی۔ اب میں آپ سے یہ بھی شکایت نہیں کر سکتی کہ آپ اتنے طویل عرصے بعد کیوں آئے کہ وجہ میرے سامنے ہے۔

پھر بہت سارے دن کیا بہت سارے مہینے گزر گئے۔

اور اُس سہ پہر جب وہ قطیبہ سٹریٹ کے سٹڈی سرکل کی ملازم رعنا کے ہمسائے میں بصرہ سے آنے والی فیملی کی بچی حبّہ کو المصور ہسپتال دکھانے لائی تھی اور Pediatric وارڈ کے برآمدے میں تیز تیز قدموں سے چلتی تھی اُس نے مسعود بارزنجی کو دیکھا تھا۔

اُس کی آنکھیں مسعود کو دیکھ ٹمٹمائیں نہیں بس ذرا پھیکی سی مانوسیت کی روشنی

جھلملائی تھی وہاں ۔مسعود رُک گیا۔شوق سے اُسے دیکھا۔ معذرت کی کہ اُسے فوراً (Epic) کے بُلانے پر واپس جانا پڑا تھا۔

ابھی کل شام وہ عراق پہنچا ہے۔

خود سے چند قدم پیچھے کھڑی عورت کے ساتھ کھڑی نو دس سالہ بچی کے بارے میں اُس نے مسعود کو بتایا کہ بچی کے پیٹ پر ٹیومر ہے چھ ماہ پہلے ایسے ہی ٹیومر کا بصرہ میں آپریشن ہوا تھا۔اب پھر یہ پیدا ہوگیا ہے۔ڈاکٹروں نے بس دو تین ماہ بچی کے مزید زندہ رہنے کا کہا ہے۔

مسعود جھکا۔بچی کے پیٹ سے فراک اٹھا کر دیکھا۔اور پھر قریب کھڑی افسردہ سی عبیر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

Lymphatic Cancer ہے یہ۔بصرہ کے گردونواح کی بہترین زراعتی زمین اتحادیوں کے میدان جنگ تھے۔یورینیم شیلوں کی بھرمار نے زمین کو زہر آلود تو کرنا تھا۔اب غریب لوگوں نے اُس زمین میں اُگے ٹماٹر آلو پیاز بھی کھانے تھے اور پھر ان کا شکار بھی ہونا تھا۔

بس یہ تو شکار ہوئی پڑی ہے۔

وارڈ ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں، پھولے پیٹوں،مدقوق چہروں،بُجھی آنکھوں اور ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں والے بچوں سے بھرے پڑے ہیں۔ڈاکٹر بیچارے کیا کریں۔نہ دوا نہ دارو۔نہ بجلی نہ گیس۔نہ دُودھ نہ خوراک۔مر رہے ہیں کہ ظالم حکمرانوں اور بدمعاش امریکہ برطانیہ نے مرنے پر مجبور کردیا ہے۔

مسعود نے دیکھا تھا اُس کی چمکتی آنکھوں سے دو آنسو اُس کے سیاہ کارڈیگن پر گرے تھے۔

اچھاخداحافظ۔وہ آگے بڑھنے لگی جب مسعود نے کہا۔عبیر میں رات کا کھانا آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا۔"

رات بہت ٹھنڈی تھی۔خالد بن ولید روڈ کا یہ گھر اندر باہر سے تاریخی سٹائل کا انداز لیے ہوئے تھا۔چند کمروں کی سجاوٹ اگر خالصتاً مغربی انداز کی تھی تو وہیں عراقیوں کی مخصوص روایت کا حامل ایک کمرہ بھی تھا۔طعام کا بندوبست وہیں تھا۔اور بہت گھریلو محبت بھرا ماحول تھا جہاں خاتون خانہ کے ساتھ ساتھ دونوں لڑکیاں بھی خوش دلی و خوش طبعی سے باتوں اور سروس میں مگن تھیں۔کھانوں کی بھرمار نہیں تھی۔چاندی کی سینی میں ملقوبہ آیا تھا۔گھر کے سب افراد بمعہ گھر کی خادمہ کے بیٹھے اور کھانا کھایا گیا۔

قہوہ پیتے ہوئے عبیر کی والدہ نے کہا۔

"ہم اپنی اس بیٹی کا کیا کریں جس کی ہر سانس کے اُتار چڑھاؤ میں عراق کا ہوکا ہے۔صدام کے کاموں پر اعتراض ہے۔بعث پارٹی کی پالیسیوں پر تنقید ہے۔کس مشکل سے سمجھاتے ہیں کہ عقل سیکھو مروا دے گا صدام تمہیں بھی اور ہمیں بھی۔سُنتی ہی نہیں۔

مسعود نے دفعتاً نگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔وہ دیوار کے ساتھ پشت جوڑے قہوہ کا بلوری کپ ہاتھوں میں تھامے کس بے نیازی سے بیٹھی اُسے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں سے پیتی تھی۔کمرے میں کینڈل لائٹ بکھری ہوئی تھی۔

ولدہ نے تنقید کا پھر وار کیا۔

"اب ہماری کیا مجال کہ لوڈشیڈنگ میں ہم سی پی یو یا ایمرجنسی لائٹ جلائیں۔سچ تو یہ ہے مسعود کہ اسے یہ ہمارا قدرے ڈھنگ سے رہنا بھی بہت کھلتا ہے۔

مسعود ہنسا تھا۔ایک بار پھر اُسے دیکھا تھا۔

الف لیلیٰ کی سرزمین پر نظار قبانی کی باغیانہ شاعری جیسا ایک کردار۔

اور رات کوانہوں نے اُسے جانے ہی نہ دیا۔روک لیا۔

عراق نیشنل آرکیسٹرا رباط ہال میں پروگرام پیش کر رہا تھا۔مسعود اُس میں مدعو تھا۔اُس نےفون کیا۔

عبیر اگرتھوڑے سے وقت کیلئے آجاؤ۔

جواباًوہ بولی تھی۔

"مسعودلعنت بھیجو وہاں جانے پر۔چلو میں تمہیں وہ میوزیم دِکھا کرلاؤں جہاں عماریہ شیلٹر میں پناہ گزین بوڑھے بچے اورغریب عورتیں ذلیل امریکیوں کی تباہ کن بمباری کے ہاتھوں شہید ہوئیں۔

وہ کھلکھلاکرہنس پڑا۔

" کچھ رحم کرو۔زندہ رہنے دو مجھے۔میں ابھی کرامہ اسپتال سے آرہاہوں۔پھر وہ زبردستی گھسیٹ کراُسے آرکیسٹرادکھانے لے گیا۔

رباط ہال لوگوں سے بھراپڑا تھا۔

نشستیں اگلی رو میں تھیں۔

کنڈکٹرپوڈیئم (Podium) پر چڑھا۔عبیر نےعراق کے اِس مایہ ناز کنڈکٹر محمد امین عزت کوگہری نظروں سے دیکھا تھا۔اُس کابایاں بازو متحرک نہ تھااور راس ہاتھ کی انگلیاں باہم جُڑی ہوئی تھیں۔"ارے یہ کیا"۔مظطرب سی آنکھوں سے اُس نے مسعودکو دیکھا۔اُس کے ساتھ ہونے والے المیے سےتو وہ آگاہ ہی نہ تھی۔پاور سپلائی کی فراہمی باقاعدہ نہ ہونے کی وجہ سے عام عراقیوں کی طرح مُلک کا یہ مایہ ناز فنکار بھی کیروسین آئل استعمال کرنے پر مجبور ہے۔کہیں کھانا پکاتے ہوئے چولہا پھٹ گیا تھا،امین عزت کی بیوی جل کرمر گئی اوراُسے بچاتے ہوئے اُس کا یہ بازوبھی سارا جل گیا اورانگلیاں جُڑگئیں۔

"اُف میرے خدا۔"

وہ دکھ اور اضطراب کے گہرے سمندر میں گر پڑی۔ ایک ہُوک سی بار بار اس کے اندر سے اٹھتی۔

تبھی ایک عجیب سی بات ہوئی۔

آرکیسٹرا شہرہ آفاق موسیقار چائیکوسکی کی مشہور سمفنی نٹ کریکر سوٹ NutCracker Suite کی ریہرسنگ کر رہا تھا۔ مگر بہت بے آہنگی سی نظر آئی تھی پھر جیسے سب کچھ رُک گیا۔ تاسف اور دُکھ بھرے لہجے میں محمد امین عزت کی آواز بلند ہوئی تھی۔

کلارینٹ Clarinets میں سے ریڈز غائب ہیں، وائلن میں سے تاریں۔ میوزیکل سکورز سخت ہو گئے ہیں۔ پرانے وقتوں کے جھلی نما کاغذ کی طرح۔ کاغذ کا حصول ان کیلئے مشکل بن گیا ہے۔ اِس قدیم اور شاندار آرکیسٹرا کے صرف دو لوگ یہاں رہ گئے ہیں۔ باقی کے سارے دنیا میں جہاں جہاں ان کے سینگ سمائے، چلے گئے ہیں۔ میں انہیں الزام نہیں دیتا۔ آخر کو پیٹ اور ضروریات زندگی کے کتنے مطالبات ہیں۔

عبیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے مسعود سے کہا کہ آخر ہم لوگ اتنے بزدل کیوں ہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ میں سٹیج پر جاتی ہوں۔

وہ بے تاب تھی۔ کھول رہی تھی۔ مسعود اگر اس کے ہاتھ نہ تھامے بیٹھا ہوتا اُس نے سٹیج پر چڑھ جانا تھا۔

شو ہوا۔ جو کچھ فنکار کر سکتے تھے۔ وہ انہوں نے کیا۔ مگر جیسے مزہ نہ آئے۔ جیسے سارا لطف کرکرا ہو جائے۔ وہ والی بات تھی۔

ہم بھی کیا کریں۔ ہم انہیں باہر سے نہیں منگوا سکتے ہیں۔ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اپنے طور پر جو کچھ ہو سکتا ہے اس سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دن جب یونہی مسعود نے کہا۔عبیر بہت مدت گزری بغداد کے کوچہ و بازاروں میں نہیں پھرا۔جی چاہتا ہے کسی دن چکر لگاؤں۔پرانی یادیں تازہ کروں۔

کمال ہے۔وہ ہنسی تھی۔پہلے کیوں نہیں کہا۔چلو ابھی چلتے ہیں۔

آج نہیں۔کسی اور دن پر رکھو۔آج تو کہیں پارک،کسی باغ،کسی کھلی جگہ پر جانے کا موڈ ہے۔

صدام کی کچھ اچھی باتوں میں سے ایک بغداد کو خوبصورت بنانا بھی تھا۔خوبصورت باغ، پارک بنائے تو انہیں مجسموں اور یادگاروں سے سجا دیا۔تاریخ کا شاید ہی کوئی کردار ہو جس کا مجسمہ بغداد میں نظر نہ آئے۔پر تم دیکھو کہ اِسے خوبصورت بنا کر اجڑوا دیا اور پھر قلیل مدّت میں دیووں جنّوں کی طرح کام کروا کے سارا انفراسٹرکچر اور عمارتیں مرمت کروا دیں۔کیا شے ہے یہ صدام بھی۔

"ارے ہاں مسعود تم عراق کے مایہ ناز آرٹسٹ محمد غنی سے ملے ہو یا نہیں۔اُس کے سٹوڈیو کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ان کمبخنوں امریکیوں کی 1991 کی بمباری میں۔اور جانتے ہو دنیا بھر میں مانے گئے اِس فنکار نے کیا کہا۔

عراقی اپنے مُلک پر بے حد نازاں قوم ہے۔میں تو کبھی عراق چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔یہیں رہوں گا یہیں مروں گا۔

اِس ایک ہفتہ میں دونوں نے ایران،عراق اور نامعلوم سپاہیوں کی یاد میں بنائی جانے والی یادگاروں کو دیکھا۔خلیجی جنگ کی تباہ کاریوں اور اس کے نتیجے میں لگنے والی پابندیوں پر عبیر ہیر پھیر کر بحث کرنے سے باز نہ آتی کہ یہ جنگیں کیوں ہوئیں آخر۔مسلمان نے مسلمان کا گلا کاٹا۔اور دُنیا کے مفاد پرستوں کو خوش ہونے کا موقع دیا۔

شہدا برج دونوں کی یادداشتوں میں اپنے اپنے داوؤں کے حوالے سے

تھا۔دونوں برج پر کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کی تصاویر بنائیں۔عراق کو جمہوریہ بنانے کی ہر جدوجہد اسی پُل پر آ کر ختم ہوئی تھی۔عمیر نے اپنے دادا کی بہت پیاری سی ہُدیٰ کو یاد کیا اور دُعا کی۔

"مسعود کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے اسی پُل پر کھڑے ہو کر اپنی پوری طاقت سے گلا پھاڑ کر صدام کو آواز دوں اور پوچھوں ذات کے بت کو خدا مت بناؤ۔عراق کو راکھ کا ڈھیر بنانے پر تُلے ہوئے ہو۔تمہاری حماقتوں نے عراق کو پاتال میں پھینک دیا ہے۔سونا اُگلتے مُلک کے غریب لوگ روٹی اور دوائی کیلئے مر رہے ہیں۔"

وہ ہنسا اور بولا۔

"ایسی عقلمندی کا مظاہرہ کبھی مت کرنا۔تم نے اس کے سگے دامادوں کا انجام دیکھ لیا نا دونوں بیٹیوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر کے بٹھا دیا ہے نا۔"

التحریر سکوائر میں مسعود نے اپنے بچپن کو یاد کیا۔اُس کی ماں کو کُکے کی چیز لینی ہوتی تھی۔ڈبل ڈیکر میں بیٹھتی اور التحریر آجاتی۔

کیا دن تھے۔اُس نے گردوپیش کو والہانہ انداز میں دیکھا تھا۔

اگلا ڈیڑھ دن دونوں نے کرخ کے راؤنڈ سٹی میں اُس کے گھر کو ڈھونڈنے میں ضائع کیا۔جہاں کبھی مسعود اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔

عمیر قدیم بغداد کے ان تنگ و تاریک گلیوں اور ان میں بکھرے بازاروں سے خود بھی نا آشنا تھی۔حیرت سے دیکھتی تھی۔

"دیکھو ہمیں اپنی مُلکی ثقافت کو جو ان گلی کوچوں میں بکھری ہوئی ہے۔دیکھنے کی کتنی ضرورت ہے۔عمیر میرا گھر گلی کی نکڑ پر تھا۔بیٹھک کا دروازہ متوازی گلی میں کھلتا تھا۔بالمقابل جو گھر تھا وہاں نبیذ ملتی تھی۔اُس گھر کے ساتھ کھجور کے درختوں کا جوڑا تھا اور

جانتی ہو وہ درخت کتنے پرانے اور کتنے تاریخی تھے۔

اور عبیر نے ہنستے ہوئے کہا تھا" تم کتنے عرصے سے آرہے ہو عراق اور تم نے کبھی اپنے بچپن کو ڈھونڈ ونے کی کوشش کی۔

کی۔عبیر کی۔بہت بار کی۔مگر اُلجھے ہوئے دھاگوں کے گچھے جیسے اِس گورکھ دھندے میں کچھ نہیں ملا۔تمہیں لایا تھا کہ شاید کچھ مدد ہو جائے۔

چلو ایک بات تو ہے کہ تمہارے طفیل میں نے بھی یہ سب دیکھا۔ایک آدھ بار میں یہاں کسی فیملی کے بچوں کو دیکھنے آئی تھی،مگر بھول بھلیوں میں نہیں پڑی کہ جو لوگ ساتھ تھے وہ راستوں سے شناسا تھے۔یہاں کی کچی پکی گلیاں سڑکیں،تنگ بازار اور ان میں بکھرا قدامت کا حُسن میں نے تب نہیں دیکھا تھا۔

پھر وہ چلا گیا تھا۔اس کا لہجہ معمول کا سا ہی تھا۔بس دُکھ کی گھلاوٹ ضرور محسوس ہو رہی تھی جب وہ بات کرتا تھا۔

عراق جہنم میں دھکیل دیا ہے اِن ظالموں نے۔نو فلائی زون کی کسر باقی تھی۔اُردن تک پہنچنے کیلئے چوبیس گھنٹے کا سفر۔اتنے لمبے صحرائی سفر کرنے کے تصور سے مجھے ہول آرہا ہے۔

اور بس۔

عبیر نے یہ سُنا مگر سر اٹھا کر اُسے نہیں دیکھا۔

دو تین دفعہ عبیر نے نہ چاہتے ہوئے بھی موبائل چیک کیا۔کوئی پیغام،کوئی بات کچھ نہیں تھا وہاں۔

پر چند دنوں بعد ایک چھوٹا سا خط اُسے ملا تھا۔

مواقع بہت مِلے تھے۔پر دل کی بات کہنے میں کیا چیز مانع تھی نہیں جانتا۔یادگار

شہدا پر جھیل کے پاس میں نے کہنا چاہا تھا۔ جب تم نے میرے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے نظار قبانی کو گنگنانا شروع کیا تھا۔

ہمارے صحراؤں کا تیل
آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا ہے
ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
ہمارا تیل فاحشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے

میں نے کہنا چاہا تھا۔عمیر دھیرے دھیرے یہاں اونچی آواز میں بغاوت کی کوئی بات خواہ سامراجیوں کے خلاف ہو یا حکمرانوں کے۔گولی کی طرح لڑ جائے گی۔کوئی نہیں جانتا۔شاعر نے کیسے دھکے کھائے تھے۔

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔مجھے اچھا ہی نہیں لگا تمہیں ٹوکنا۔

گو عمیر عراق کا حُسن ہے۔بغداد کی خوبصورتی ہے۔مگر میرے لیے اُس کی رعنائی اُس کا گداز دل ہے جس میں بسنا میری دِلی تمنا ہے۔میں کُرد بھی ہوں اور سُنی بھی۔کُرد نا قابلِ اعتبار ہیں۔کسی تھالی کے ڈھکن نہیں کسی سیٹی کا پیندا نہیں۔ایرانی۔عراقی ترکی اور عرب تہذیبوں کے ساتھ ساتھ اپنے مقامی رنگ میں بھی رنگے۔اپنی شناخت، اپنی نسل کیلئے تڑپتے۔

کیا کریں بیچارے۔تین مُلکوں میں بٹے ہوئے۔کبھی ترکوں سے جوتے کھاتے اور انہیں کھلاتے۔کبھی ایرانیوں سے پھڈے کرتے۔کبھی عراقیوں کے خلاف بغاوت علم بلند کرتے۔کبھی برطانیہ اور کبھی امریکیوں کے آلہ کار بنتے۔

شاید تم نے اُس مشہور زمانہ عربی کہاوت کو سُنا ہوگا طاعون کی تین اقسام ہیں۔چوہے، ٹِڈی دِل اور کُرد۔یوں کُرد بھی بڑی شے ہیں۔عربوں کیلئے انہوں نے بھی بڑا

کچھ گھڑ رکھا ہے۔سب سے زیادہ فتنی تو وہی ہے جس میں بیچارے اونٹ کو جانور اور عربوں کو انسان ماننے سے انکاری ہے۔دیکھو تو کتنی قباحتیں ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔

اور عمیر نے خط بند کرتے ہوئے بس اتنا کہا۔

اب میں شیعہ ہوں۔عرب ہوں تو بھلا اس سے کیا؟

پروفیسر ڈاکٹر احمد حلاوی کی میڈیسن کلاس میں جب پروفیسر اپنی عادت کے مطابق موضوع سے پھسل کر دَورِ جدید کی دریافت شدہ بیماری شیزوفرینیا میں اُلجھا۔عمیر جو بظاہر منہ اٹھائے لیکچر سُننے میں متوجہ ہونے کا بھرپور تاثر دیتی تھی۔مگر دراصل اُلجھے ذہن سے خود سے کہے چلی جاتی تھی۔

"ہائے مجھے تو یہ شیزوفرینیا ہی ہو جائے۔اِس منحوس مارے وطن کی محبت کے مالیخولیے نے میرا دن رات کا چین حرام کر دیا ہے۔کیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے اس کے وجود پر گھرے ہوتے جاتے ہیں۔"

دفعتاً اُس کے ساتھ ابھی باہر سے آکر بیٹھنے والے جلال شیلابی نے اپنے موبائل کی سکرین اُس کے سامنے کر دی۔اُس نے سر جھکا کر پڑھا۔"ارے ناقابل بیان حیرت سے آنکھیں جیسے لبالب بھر گئی تھیں۔یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اُس نے جلال شیلابی کو گھورا۔

بس لمحوں کی دیر تھی۔ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے پھر چوتھے حتیٰ کہ آدھی کلاس خبر کی زد میں تھی پھر جیسے خبر کے غبارے کے ابھراؤ زدہ پیٹ کو کسی نے نوکیلی پن سے چھو دیا اور وہ پھٹ گیا۔کلاس میں طوفان آگیا تھا۔

نائن الیون کا حادثہ زیر بحث تھا۔رنگ رنگ کے تبصرے اور باتیں گردش میں تھیں۔اِس بڑے بدمعاش کے محفوظ گھر کی فصیل میں کسی نے ہتھوڑا مارنے کی جرأت کی۔بڑی بات۔بڑی بات۔

سارا بغداد رقصاں تھا۔ لوگوں کے تپتے جذبات پر جیسے ٹھنڈے ٹھار پانی کے چند چھینٹے پڑ گئے ہوں جیسے پیاسے ہونٹوں کو یخ اُنگلی چھو لے۔

مسعود اُن دنوں نیو یارک میں تھا۔ رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا اُس سے۔ کوئی چار پانچ دنوں بعد اُس کی میل آئی۔

نیو یارک تو جیسے کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا ہے۔ ایک نیا ڈرامہ۔ اب دیکھنا اس کی آڑ میں اِس بدمعاش ریاست کی چالاکیاں۔ کرتی کیا ہے یہ؟ با اثر یہودیوں نے تو ابھی کہنا شروع کر دیا ہے۔ عراق پر حملہ ناگزیر ہے۔ افغانستان کا مکھو پہلے ٹھونپا جائے یا عراق کا۔ انتظار۔

آنے والے مہینوں میں مسعود کے بھیجے گئے غیر مُلکی اخبار نویسوں کے تجزیئے ان کی رپورٹیں وہ پڑھتی اور کُوھ کر خود سے کہتی۔ عراق اور صدام کے کیمیائی اور ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیروں سے کسی اور کو کوئی خطرہ لاحق ہو نہ ہو۔ مگر اس اسرائیل کو پیچش لگ گئے ہیں۔ اور اُس بڑے بدمعاش کو تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک اسرائیل محفوظ ہو، دوسرے تیل کے ذخائر قبضے میں رہیں، باقی سب خیریت ہے۔

2002 کے آخری دنوں میں مسعود عراق آیا۔ وہ سو رہی تھی۔ جب موبائل کی بیپ سے جاگی۔ نیند میں ہی اُس نے ہیلو کہا تھا۔ پر مسعود کا جان کر وہ چھلانگ مار کر بستر سے اٹھی۔

کب آئے؟ اور بتایا کیوں نہیں؟ کہاں پر ہو۔؟ ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوالات۔

وہ اربیل سے بول رہا تھا۔ کل شام کو پہنچوں گا۔

پیچھے سے کسی نے قرمانجی (کُردوں کی زبان) میں کہا۔ چار دن تو رہو۔ بھاگنے

بھی لگ گئے ہو۔

عبیر کے پوچھنے پر مسعود نے بتایا میری اماں ہیں۔پانچ دن ہو گئے ہیں گوڑے منڈ بیٹھا ہوں مگر وہ رہتی نہیں۔دراصل ڈیموکریٹک پارٹی آف کردستان نے دعوت دی تھی۔عمان کی بجائے استنبول کا راستہ چنا۔

مہمان کے استقبال میں تکلّف ہرگز نہیں تھا۔ہاں البتہ ایک پُر جوش دلی اہتمام ضرور تھا۔عبیر نے نگن سے مسگوف مچھلی کی عراقی ڈش بنائی۔عراقی قبہ بنایا۔مسعود بہت سے تحائف لایا تھا۔

عبیر بالعموم سادہ مزاج کی لڑکی تھی۔مگر پھر بھی اُسے یہ بے حد اچھا لگا۔

Cool Water کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے اُس نے اتنا کہا۔

"مسعود میں نہیں کہوں گی کہ تم یہ سب کیوں لائے۔مجھے اچھا لگا ہے۔

اور جب وہ دونوں قہوہ پیتے اور باتیں کرتے تھے۔مسعود نے دُکھ سے بوجھل لمبی سانس کھینچ کر کہا تھا مجھے تو عراق کی بربادیوں کے چرچے جیسے آسمانوں تک میں سُنائی دیتے ہیں۔

عبیر نے دُکھ اور یاس میں لپٹی ایک لمبی آہ نکالی۔

بہت کم ظرف دشمن ہے۔

"دشمن ہمیشہ کم ظرف ہوتا ہے۔"

اور پھر مسعود نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ وہ اُچھل سی پڑی۔

کہا تو صرف اتنا ہی تھا کہ عبیر یہ ممکن ہے تم اپنے بھائی مشعل کے پاس انگلینڈ چلی جاؤ۔

"ارے مر کر بھی نہ جاؤں اُس پوڈل کے دیس میں۔مجھے تو ویسے ہی اُس دُم

ہلاتے گُھٹتے سے نفرت ہے۔

"چلو اگر یہ پسند نہیں تو شادی کر کے میرے ساتھ چلی چلو۔"

"مسعود کیا ہو گیا ہے تمہیں۔مشعل کے پاس چلی جاؤں۔شادی کر لوں اور تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔کیوں مشعل کے پاس جانے کی تُک۔اور رہی شادی تو وہ میں نے ضرور تم سے کرنی ہے لیکن میڈیکل پورا کرنے پر۔

عبیر نے اُس کی آنکھوں میں بکھرے چہرے پر پھیلے بہت سے جذبات پڑھے۔اُنہیں سمجھی اور بولی۔

"عراق کی لاکھوں بیٹیاں ہیں مسعود۔میں اکیلی نہیں۔اور ہاں میں اپنا وطن چھوڑ کر کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔"

چلو چھوڑو اِن سب کو۔آؤ تمہیں میں زوارہ پارک دکھا کر لاؤں۔صدام کے چند خوبصورت کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

مارچ کے پہلے ہفتے انٹرنیٹ پر ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے اگر مسعود کے لہجے میں اضطراب سا تھا تو وہیں وہ بھی اضطراب کی سُولی پر چڑھی بیٹھی تھی۔

ابھی چند دن پہلے میں نیویارک ٹائمز کے مضامین دیکھ رہی تھی۔امریکہ کے پاس عراق کے لیے تحدید کا راستہ تو موجود ہے صدام نے کبھی بھی کوئی کام ایران عراق جنگ ہو یا کویت پر حملہ پیشگی اجازت یا مرضی کے نہیں کیا۔اسی لیے اسرائیل پر چڑھ دوڑنے کا کوئی منطقی جواز نہیں۔ساری باتیں فضول ہیں۔یہ بڑے لوگوں کے سیاسی ہتھکنڈے ہیں کہ صدام ایٹمی اور کیمیائی ہتھیار بنا رہا ہے اور دنیا کو شدید خطرہ ہے۔ساری بکواس جنگ کا طبل بجانے کی ہے۔وجہ تو وہی پرانی تیل اور مشرقِ وسطیٰ پر گرفت کی ہے۔پر مصیبت تو یہ بھی ہے کہ اپنے غدار بھی یہی سوچتے ہیں کہ سامراجی عراقیوں کے حق میں بہتر ہوں گے۔میرے تو

اپنے ماموؤں کی یہی سوچ ہے۔کسی اور کا رونا کیا روؤں۔

کبھی کبھی مسعود میں سوچتی ہوں کہ اس عراق اور خاص طور پر بغداد کے مقدر میں تباہیاں کیوں لکھ دی گئی ہیں۔

اور پھر تباہی کُوکتی ہوئی آ گئی تھی۔ماضی کے ہلاکو خان نے اُس وقت کی عراقی فوج اور حکومت کے لوگوں کو خریدا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔آج کے ہلاکو خان نے بھی الجبوری، مشہدانی جیسے غدار احمد شیلابی اور کنعان ماکیہ جیسے ضمیر فروش لوگ حاصل کر لیے تھے۔

بغداد ڈھے گیا۔اور عبیر کو آگ و بارود سے محفوظ رکھنے کیلئے گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی۔گردوپیش کو دیکھا۔کلیجہ تو جیسے پھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔اُمنڈتے آنسوؤں کی یلغار نے حملہ کیا۔اُس نے بھی انہیں روکا نہیں۔بہنے دیا۔رخساروں پر لڑیوں کی صورت اُن کا بہاؤ۔وقفے وقفے سے کسی چھوٹی سی سسکی کی صورت میں اندرونی درد کا اظہار۔ولدہ نے یہ سب دیکھا تھا۔اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اُس نے خود سے کہا تھا۔آخر ہمارے پاس اپنے وطن کی بربادی پر نذرانہ پیش کرنے کیلئے اس کے علاوہ ہے ہی کیا۔

بغداد موصل روڈ پر چڑھنے سے پہلے ڈرائیور نے گاڑی شہر کی اندرونی چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے گزاری تھی۔بغداد کا مضافات ترقی پذیر شہروں جیسا ہی تھا بے ترتیب اور بکھرا ہوا سا۔مگر اس بے ترتیبی پر جنگ کا فضلہ جو رنگ جما رہا تھا وہ وحشت ناک تھا۔

سرینۃ الثانیہ تک چھ پوسٹیں بھگتانی پڑیں جو سب کی سب امریکی سپاہیوں کے قبضے میں تھیں۔

حفاظتی انتظامات ۔ریت کی بوریوں کی دیواریں جنہیں لوہے کی تاروں کے حصار میں قید کیا گیا تھا۔

پہلی چیک پوسٹ پر گاڑی روک لی گئی۔امریکی فوج کی جی آئی بٹالین کے چھ جوانوں نے گاڑی کو اپنے حصار میں لے لیا۔سواریوں کو اُترنے اور تلاشی دینے کو کہا گیا۔

کیسا المیہ۔ہمارا وطن،اور ہم تلاشی دیں انہیں جو غاصب ہیں۔جارح ہیں۔بندوقوں اور گولیوں کے سروں پر تیرتے یہاں آئے ہیں۔رحم پروردگار رحم۔

اُس کے بڑے ماموں نے اسپیشل اجازت نامہ بغداد زون کے چیف ایڈمنسٹریٹو کے ذاتی دستخطوں سے دیا تھا کہ زیادہ پوچھ پڑتال نہ کی جائے مگر پھر بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔

عراقی پھولوں سے کتنا پیار کرتے ہیں۔اُس نے سوچا کہیں کہیں ایسی ہی کسی دیوار پر پیلے پھولوں کی بیل بچھی نظر آتی تھی۔

تیسری چیک پوسٹ پر عبیر کا نام لکھتے ہوئے پوچھا گیا۔اس کا مطلب؟

عبیر نے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

تمہارا اِس سے مطلب؟مگر والدہ نے بیٹی کو ڈپٹا اور اُن سے مخاطب ہوئی۔

یہ عربی زبان کا لفظ ہے زعفران کی خوشبو اور کیسر کا رنگ مل جائے تو اُسے عبیر کہتے ہیں۔

قدرے عمر رسیدہ کالا امریکی ہنسا اور بولا۔

تمہاری بیٹی اپنے نام کا عکس ہے۔

یہ چھٹی چیک پوسٹ تھی۔کیموفلاج یونیفارم میں آہنی ٹوپیوں کی پیشانیوں پر جُڑی سپاٹ لائٹوں سے سروں کو ڈھانپے چار ایک جیسی قد و قامت والے لڑکے گاڑی کے گرد کھڑے ہو گئے تھے۔

ڈ کی چیک ہوئی ۔ولدہ عبیر او ر ثناء کو نکال باہر کھڑا کیا۔عبیر نے سیاہ عبایا پہن رکھی تھی ۔ہڈ میں صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں ۔جھیل جیسی آنکھیں جو حُزن یاس کے پانیوں سے بھری ہوئی تھیں ۔

ایک نے رعونت سے کہا۔چہرہ دکھاؤ۔نقاب نیچے کرو ۔

کیوں کروں ۔کیوں کروں ۔اُس نے ترشی سے کہا۔

ولدہ نے ہاتھ دبایا۔اور نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی ۔لڑکیاں پردہ کرتی ہیں ہماری سوسائٹی میں ۔

دراصل ہمیں احکامات کی پیروی کرنا ہوتی ہے ۔تلاشی کا حکم ہے ۔

اُس نے ایک جھٹکے سے چہرہ ننگا کرتے ہوئے مغلظات کا طوفان اٹھا دیا۔چاروں گُم سُم اُسے دیکھتے اور اُس کی گالیاں سُنتے تھے ۔ایسا چاند چہرہ کہ جس نے انہیں بٹر بٹر تکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کاروائی ضرور ہوئی مگر نرم انداز میں ۔گاڑی کا نمبر نوٹ ہوا۔جہاں سے آئے تھے اور جہاں جانا تھا درج ہوا۔

کاش میرے پاس ہینڈ گرینڈ بم ہوتے تو میں اِن کے چیتھڑے اڑا دیتی ۔

اُس نے دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

مصطفےٰ البرزانی کی نگاہیں کب سے عبیر پر جمی تھیں ۔اُس کی شکستگی اور دل گرفتگی پر انہوں نے پھاہا رکھنا چاہا تھا۔

عبیر ہم امید کر سکتے ہیں کہ شاید عراق کے ساتھ جاپان والی پالیسی اپنائی جائے ۔اگر ایسا ہوا تو یہ عراق کیلئے بہت اچھا ہوگا۔

وہ چند لمحوں تک اپنے دادا کو دیکھتی رہی ۔پھر بولی ۔

جذی ایسا نہیں ہوگا۔ کسی خوش فہمی میں مت رہئے۔
دونوں کے درمیان اب طویل خاموشی تھی۔

اُس نے ٹی وی آن کیا۔ منظر نے اُسے ٹھٹھرا کر کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صدام کا نیا عالی شان محل گورے کالے امریکی فوجیوں کے بوٹوں تلے روندا جا رہا تھا۔ پہلے مرکزی گیٹ سے اندر کمروں کی آرائش و زیبائش فرنیچر، زینوں کی ریلنگ تک شاہانہ کروفر کے پٹارے کھلے پڑے تھے۔

"اُف"

پل بھر کیلئے اُس نے آنکھیں بند کیں۔ کھولیں اور کہا۔

"کاش تم نے یہ سب غریبوں پر خرچ کیا ہوتا۔

صدام کی دوسرے نمبر کی بیٹی راغدہ، اس کی چچی زُخرف کی سکول میں کلاس فیلو اور دوست تھی۔ رعنا سے بھی اُس کا پیار تھا۔ دونوں بیٹیوں کی اپنے بھانجوں حسین کمال اور صدام کمال سے طلاق دلوا کر دامادوں کو موت کے گھاٹ اُتروا کر صدام نے عجیب بربریت کا ثبوت دیا تھا۔ اُن دنوں چچی فلوریڈا سے بغداد آئی ہوئی تھیں۔ تعزیت کیلئے وہ اِسی نئے محل گئی تھیں۔ انہوں نے تو عبیر سے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔

توبہ کریں۔ عبیر نے کہا۔ اُس کے ہاں کسی شوق کا اظہار نہیں تھا۔ واپسی پر محل کی شان و شوکت کا جو بیان تھا، اُسے سُنتے ہوئے عبیر کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ جب قارون کے جیسے محلوں میں رہنے کا شوق ہو اور زرکثیر سے کھداوایاں کروا کے نمونے حاصل کیے جائیں تو پھر محل مینارے شاندار تو ہونے ہی ہیں۔

اُس نے ٹی وی بند کر دیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ہواؤں میں

تیزی تھی ۔درختوں کا جھلا رشور مچا تا تھا۔

اُس نے تپائی پر پانی کا خالی گلاس رکھا تھا۔جدی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ۔انہیں سُوپ پلا کر کمبل سے ڈھانپ کر وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کمرے میں آئی تھی ۔

اُس کے سرہانے سعدی یوسف کی منتخب نظموں کی کتاب پڑی تھی۔اُس نے صفحے کھولے یونہی پھولا پھرولی کرتی رہی ۔

پھر نظار قبانی کی نظم یاد آگئی ۔

صبح خبریں سُننا بہت مشکل ہے

دشمن نے ہماری سرحد نہیں پھلانگی

وہ تو چیونٹی کی طرح ہماری کمزوری کے راستے آیا ہے۔

قاسم الرحیم البرزانی کی آمد آج کل متوقع تھی۔کاش کوئی اچھی خبر ہو۔اپنے آپ سے کہتی وہ لیٹ گئی تھی۔دماغ میں کسی انگریزی شاعر کا ایک Stanza شور مچانے لگا۔جس میں لوگوں کی جگہ اُس نے عراق کو جوڑلیا تھا۔

When will Thou Save Araq

Oh, God of mercy! When?

اگلی لائنوں کو چھوڑ کر کتنی دیر تک وہ When When کی گردان کرتی رہی ۔آنکھوں کے کویوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھتی رہی ۔پھر ایسے ہی گُھچو مُچھو سی نیم دراز ہوگئی ۔جانے کب آنکھ لگی تھی۔

اُس شام آسمان ابر آلود سا تھا۔مغرب سے ذرا پہلے ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی۔آخری چیک پوسٹ کے چاروں نوجوان اپنے خیمے میں سیریا کی شہد کی آمیزش سے

تیار کردہ خاص شراب رساطون جو آج ہی کسی عراقی نے اُن کی فرمائش پر انہیں لا کر دی تھی جسے پیتے ہوئے انہوں نے "نبیذ" کے بارے میں رائے دی یہ تو نہایت فضول ہے۔ ایسے ہی اِس کا گڈا باندھ رکھا ہے۔

نشے میں مخمور ہوئے تو اپنی محبوباؤں اور اپنے بیوی بچے کی یاد میں آہیں بھرتے ہوئے عراقیوں کو گالیاں نکالنی شروع کیں کہ اِن جاہل اجڈ گھٹوں کو ڈکٹیٹر صدام سے نجات دلانے اور ان کے اسلامی فاشزم کو جمہوریت کا مزہ چکھانے کیلئے انہیں اپنے خوبصورت وطن اور آسائشوں سے بھری زندگی کو چھوڑ کر ان کالے پانیوں میں آنا پڑا۔

بس ایسے ہی لمحوں میں وہ بھوری سی آنکھوں اور زعفران کی خوشبو والی عبیر انہیں یاد آئی تھی۔ فلک شگاف سا نعرہ لگایا۔ رجسٹر کھول کر پتہ نکالا۔ جیپ میں بیٹھے اور چل پڑے۔

ایک نے یہ شاندار سی حویلی دن کی روشنی میں پٹرولنگ کرتے ہوئے دیکھی تھی۔ بلند و بالا چوبی دروازہ بند تھا۔ دستک پر ملازم نے چوبی کھڑکی کھول دی کہ بغداد سے قاسم الرحیم البرزانی کی آمد متوقع تھی۔

پہلا نشانہ ادھیڑ عمر ملازم تھا۔ چیتے جیسے پھرتی سے انہوں نے سب کمروں کو اپنے حصار میں لیا۔

مصطفیٰ البرزانی کو پل نہیں لگایا۔ بیڈ پر غنودگی میں ہی سُلا دیا۔

دفعتاً وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ کمرہ اُس کی ماں اور بہن کی چیخوں سے بھرا ہوا تھا۔ چند لمحوں کیلئے اُسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے یا بغداد کی گلیوں بازاروں میں ناچتا تھرکتا منظر اُس کے گھر آ گیا ہے۔

کمرے میں چار فوجی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ اُس کی ماں گھبرائی ہوئی خوفزدہ اونچے اونچے انگریزی میں کہتی تھی کہ وہ کیوں اُن کے گھر آئے ہیں؟ اُن کا یہاں کیا

کام؟

ابھی تو بمشکل اُس کی آنکھوں نے اس منظر کی حقیقت کو قبول کیا ہی تھا کہ اس سے بھی کہیں ظالمانہ، سفاکانہ اگلا منظر سامنے آ گیا۔ دو ہاتھوں نے آگے بڑھ کر دونوں کو نشانے پر رکھا اور پَل بھر میں وہاں خون کے فوارے تھے۔ چیخیں تھیں۔ دھڑام سے گرتے وجود تھے۔ وہ تو کسی کو سنبھالنے آگے بھی نہ بڑھ سکی تھی۔

اب قیامت گھڑی برپا ہوئی تھی۔ زعفران کی خوشبو اُڑی اور کیسر کا رنگ بے رنگ ہوا۔ پر سامرہ کا آسمان ویسے ہی کھڑا تھا۔ ٹوٹ کر نہیں گرا۔

وہ جو تین تھے مستی میں تھے اور چوتھا جو اِس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھو سکا تھا۔ اُول فول بکتا تھا۔ اُونچے اُونچے لینڈن اور ولسن کو گنتیا کے پلّے کہتے ڈکراتا تھا۔ آخر اس لینڈن حرامزادے کو ایسی دلیری دکھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

جانتا ہوں اس سورے کو۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور یہ سب سے پہلے بنکر میں گھُستا ہے۔ عورت دلآویز بھی تھی اور بھری بھری بھی لڑکی بھی کوئی چُھوٹی سی نہ تھی۔ گلاب کا پھول نہ سہی پر موسم بہار کی بند کلی تو تھی۔

لینڈن نے خباثت بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ رونا کس بات کا؟ پڑی ہے دہ۔ لاش ہے تو کیا ہوا؟ جاؤ جُت جاؤ۔

اُس نے نفرت سے اُس کی طرف تھوکا اور غلیظ گالیوں کی بوچھار کر دی۔

جسم کی بھوک مٹی تو پیٹ کی بھوک چمکی۔ وہ کچن میں گئے۔ فریج میں سینتی ہوئی مرغیاں باہر نکلیں اور آگ پر بھُونے لگیں۔

وہ تینوں کچن میں بیٹھے روسٹ ٹانگیں کھاتے تھے۔ صحن میں زعفران کی خوشبو میں بسا اور دودھ میں ٹپکے کیسر کے قطرے میں گھُلے رنگ جیسا وجود مٹی کے تیل اور آگ کے

شُعلوں میں جلتا تھا۔ہواؤں کی چنگھاڑ اور وحشت حویلی کے درو دیواروں سے ٹکراتی، بین کرتی اور اونچے اونچے کرلاتی تھی۔اور جوتھا وزنی بوٹوں کے ساتھ صحن میں چکر کاٹتا اُنہیں گالیاں نکالتا اور موبائل پر سارے منظروں کو محفوظ کرتا پھرتا تھا۔

اُن میں سے ایک نے بوٹی کے بڑے سے ٹکڑے کو دانتوں سے نوچتے کھسوٹتے کہا۔

مجھے جوفیالز پر ترس آرہا ہے۔بیچارہ پیاسا رہ گیا نا۔اُس نے سُنا اور چنگھاڑا۔پر اس کی چنگھاڑ اُن کیلئے مطلقاً تشویش انگیز نہ تھی۔

یور فیلو۔انہوں نے اٹھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے اور باہر صحن میں آئے۔

قدرے سرخ آگ کچھ مدھم پڑگئی تھی۔اور وہاں بہت خوفناک منظر تھا کہ جیسے کِسی مصور نے سیاہ اور قدرے سُرخ گرینائٹ سے ایک مجسمہ تراش کر وہاں لِٹا دیا ہو۔وہ تینوں اس کے گرد کھڑے تھوڑی دیر دیکھتے رہے۔پھر انہوں نے ہوائی فائر کیئے اور رقص کرتے ہوئے ملٹری ٹریننگ کیمپوں میں گایا جانے والا بڑا پاپولر گیت گایا۔

This is my Riffle

This is my Gun

This is far Killing

This is far fun

فتح کے پھریرے لہراتے وہ ٹھکانے پہنچے۔جب اُن کے خراٹے گونجنے لگے۔

تب وہ جوفیالز گاڑی میں بیٹھا اور بغداد کے لئیے روانہ ہوا۔گرین زون صدام کا محل امریکی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل ہو چکا تھا۔جگہ جگہ کھڑی رکاوٹوں سے گزرتا، تعارف اور شناخت کرواتا انچارج سیکورٹی کے پاس پہنچا۔

اس وقت وہاں موجود کرنل رینک کا عراقی فوجی افسر تھا۔اُسے روکنے کی ہلکی پھلکی سی کوشش ضرور ہوئی۔

وہ جنرل کیلئے ضروری پیغام کا کہتے ہوئے آگے بڑھ سکتا تھا۔مگر وہ رُکا تھا اور اس نے اِس کیس کا سارا کچا چٹھا اُسے سُنا دیا اور تصویریں بھی دکھادیں۔کرنل ابراہیم سعد خلیلی دم بخود تھا۔عراق کی ممتاز اور سرکردہ فیملی۔وحشت اور ننگی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

اب امریکن فوجی افسر ہرصورت اِس گینگ ریپ اور قتل کی لرزہ خیز واردات کو غیر موثر بنانے پر تُلے تھے۔احمد شیلابی کی طفیلی حکومت کا ٹولہ مجرموں کے کورٹ مارشل پر مُصر تھا۔گرینڈ جیوری نے کیمپ لبرٹی میں کیس کی ساعت میں کہا کہ آخری فیصلہ امریکی جنرل کرے گا کہ کورٹ مارشل ہونا چاہیے یا نہیں۔

صفائی کے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کیس مضبوط کر دیا تھا کہ بیچارے ملزمان دہشت گردی کی مریضانہ حالت میں تھے۔ان کی بٹالین کے سترہ ساتھی عراقی مزاحمت کاروں کے خودکش حملوں میں مارے گئے تھے۔وہ تو نارمل اخلاق باختہ جنسی مجرموں کی فہرست میں ہی نہیں آتے ہیں۔

اب قاسم الرحیم البرزانی مسعود بارزنجی، مشعل البرزانی اور عبیر کے ماموؤں کے پاس اپنی ساری توانائیاں القاعدہ کی جھولی میں جھونکنے کو سوا کیا چارہ کار تھا۔

سوچیتادیدی + اروما

''ایک خبر ہے ماں۔''

ایلش ماچھ کے کودے، موٹے سفید چاول، اچار اور ٹماٹر کے قتلے کے ملغوبے سے بنا نوالہ ابھی اُس کے منہ سے قدرے فاصلے پر ہی تھا جب اُس کی غلافی آنکھوں کے بھاری پپوٹے اُس کی کمان جیسی ابروؤں سے جا جڑے اور ہاتھ معلق سا ہو گیا۔

''کیا'' ہونٹوں پر تو سناٹا تھا بس سارا چہرہ جیسے ''کیا'' کے سوال میں لتھڑا پڑا تھا۔

''اروما دت اُس پنجابی میجر سے نکاح کر کے آج ویسٹ پاکستان چلی گئی ہے؟''

''اور کل کانجی وارم کی ساڑھی اور کندن کا زیور پہن کر تم اُسی کے نکاح میں گئی تھیں نا۔ مینی تم سے ایسی اُمید نہیں تھی مجھے۔''

پانچ فٹ سات انچ کی چنبیلی جیسی رنگت والی مینی آبی رنگی ساڑھی کا پلو ننگے سڈول بازو پر پھینکتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ تلخی تھی اُس کے لہجے میں جب وہ بولی۔

''ماں کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ دوست ہے وہ میری۔ دوستی کے بھرم رکھنے

پڑتے ہیں۔''

دُکھ اور شکایت کا عنصر لہجے میں واضح گھلا ہوا تھا۔

بھات تو گویا حرام ہوگیا۔ اُٹھے ہوئے ہاتھ کا لقمہ بھی پلیٹ میں گر گیا تھا۔ ایلش ماچھ دنوں بعد پکی تھی اور پورے گھر میں اُس کی خوشبو تیرتی پھر رہی تھی۔ پر من پسند کھانا کھانا اب ممکن کب رہا تھا۔ سویتا دیدی تو دل سے نکل کر سامنے آ بیٹھی تھیں۔

سویتا دیدی جن دنوں بیاہ کر کلکتے سے ڈھاکہ آئیں۔ میں چھوٹی بوا کے ہاں مانک گنج گئی ہوئی تھی۔ پرکاش چاچا کی حویلی اور ہماری راجباڑی ایک ہی گلی کی دو انتہائیں تھیں۔ پورا مہینہ مانک گنج میں گذار کر آنے پر پتہ چلا کہ رنیش دادا کا گونا ہوگیا ہے تو بس میں دُلہن دیکھنے حویلی پہنچ گئی۔

اُس وقت ڈھاکہ کا آسمان بادلوں سے جھکا پڑا تھا۔ بارش کھل کر برسی تھی اور ابھی اور برسنے کے موڈ میں تھی۔ اُن کے گھر کے کشادہ آنگن کی سُرخ اینٹیں بارش کے پانیوں سے دُھل کر اپنی نکھری صورت سے بُہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ غربی برآمدے کے سامنے اُگے کرشنا چوڑا کے درخت میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مالوتی کے بوٹوں کا جوبن غضب ڈھا رہا تھا اور کیلے کے پتے ہواؤں کے زور سے سراٹے مارتے پھرتے تھے۔ حسبِ معمول گھر پر ویرانی کا راج تھا۔ رسوئی میں کھٹ پٹ کی آواز پر میں اُدھر بڑھ گئی۔ دروازے کی ایک سمت کھڑے ہو کر میں نے اندر جھانکا۔ اُونچی سی رنگین چوبی پیڑھی پر نرم و نازک سی بڑی آپا جیسی من موہنی لڑکی شاہی رنگی پوتھ کی ساڑھی میں لپٹی ہاتھوں میں پکڑی رنگین صافی میں لپٹی روٹیوں کو کھولتے ہوئے خود کلامی میں مصروف تھی۔

''رام بنگال کی عورت کو کبھی اچھی روٹی نہیں بنانی آئے گی۔ اب اگر یہ نرم ہوتی تو وہ کم از کم ایک تو کھاتا۔ یہ اتنی اکڑی ہوئی تو اُس کے بوڑھے دانتوں تلے کسی پتھر کی طرح

ہی محسوس ہوئی ہوں گی ۔آج پانچ دن ہو گئے ہیں تپ چڑھتے ہوئے۔''

وہ یقیناً پرکاش چاچا کے بارے میں بات کررہی تھیں۔شاید وہ بیمار تھے۔

میں نے جُوتوں سے ذرا کھٹ پٹ کی ۔اُنہوں نے گھوم کر دروازے کی سمت دیکھا۔ایک اجنبی صورت دیکھ کر پہلے حیران اور پھر مُسکراتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔

اُٹھنے سے ساڑھی کے پلّو میں بندھا چابیوں کا گچھا اُن کی پشت پر چھن کی آواز پیدا کرتے ہوئے گرا۔اُن کے محرابوں والے پاؤں آلتا سے سجے ہوئے تھے اور اُن کی چال میں ایک بانکپن تھا۔

ہم دونوں کمرے میں آ گئیں۔وہ بھرے پُرے گھر سے آئی تھیں۔یہاں تنہائی اور سناٹا تھا۔گنتی کے لوگ شوہر، سُسر اور نوکر۔یقیناً اسی لئے وہ میری آمد پر بُہت خوش تھیں اور ملتجی تھیں کہ میں گاہے بگاہے چکر لگایا کروں۔

اُن دنوں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔سومیتا دیدی اکثر اِس کا اظہار بڑے دُکھی لہجے میں کرتیں۔

''ارے اتنے زمانوں سے اکٹھے رہتے چلے آرہے ہیں۔دھرم علیحدہ علیحدہ ہے تو کیا ہوا؟ بھاشا تو ایک ہے۔رہن سہن ایک سا ہے۔محبت پیار ہے۔ہمیں تو سُوراج چاہیے۔ یہ دیس کو بانٹنے والی باتیں تو پاگل پن ہیں۔''

دراصل پرکاش چاچا تو انڈیا جانے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ اُن کی ڈھاکہ اور کومیلا میں لمبی چوڑی زمینداری نقل مکانی کے راستے میں مانع تھی۔انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ انڈیا گورنمنٹ زمینداری، جاگیرداری اور ریاستی نظام کے خاتمے کے بارے میں بڑی واضح تھی۔

سومیتا دیدی کو جو فکر دن رات گھائل کئے جاتا تھا وہ بٹوارے سے تھا کہ اگر یہ

ہوگیا تو لکیریں کھینچ جائیں گی اور سرحدوں کی لکیروں کو من چاہنے پر پاٹا نہ جا سکے گا۔ پاسپورٹ اور ویزا کا چکر شروع ہو جائے گا اور کلکتہ میں اُس کی بہنیں تو اُس کی لمبی جدائیوں کی تاب نہ لا پائیں گی۔

پھر پاکستان بن گیا۔ میں بیاہ کر چند سالوں کے لئے بیروت چلی گئی۔ جب واپس آئی تو سومیتا دیدی سے ملنے گئی اور میرے لئے یہ کس قدر تعجب کی بات تھی کہ وہ بے حد دُکھی اور اُداس تھیں۔ ارمنی ٹولہ میں اُن کا وسیع وعریض گھر ابھی بھی ویسا ہی شاندار تھا۔ پر گھر کی ویرانی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ گو گھر میں دو بچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اروما کی عمر کوئی دس سال ہو گی۔ میری میــــی جتنی اور سوشیل یہی کوئی سات آٹھ سال کا تھا میرے شہید جتنا۔

پہلی بار کی ملاقات میں تو میرا دل جیسے بڑا ابوجھل ہو گیا۔ پر کاش چاچا بُہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ بیمار بھی تھے۔ سومیتا دیدی کی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر آنسو نہ تھمتے تھے۔ اروما اُن دنوں دارجلنگ کے کونونٹ میں تھی اور سوشیل سوئزرلینڈ کے کسی اقامتی سکول میں۔

مجھے حیرت تھی۔ رنیش دادا اُن سے بُہت پیار کرتے تھے۔ کیا وہ اُن کی طرف سے دُکھی ہیں یا بچوں کی جدائی نے اتنا ملول کر رکھا ہے۔

میں نے پُوچھا تھا۔

''دیدی یہ سب کیا ہے؟ اِن خوبصورت آنکھوں میں تو ہمیشہ خوشی و سرشاری کے عکس رقص کرتے دیکھے میں نے۔ اِن ہونٹوں پر ہنسی کی پھلجڑیاں پھوٹتے دیکھیں۔ دیدی رنیش دادا کیا تمہارا خیال نہیں رکھتے؟''

''بُہت رکھتے ہیں۔'' اُن کے لہجے میں گلے گلے تک طنزیہ ہنکارے تھے۔

دُکھ اور ملال کی گھلاوٹ تھی۔

ٹیگور کی وہ خوبصورت نظم بے اختیار ہی اُن کے ہونٹوں پر آ گئی تھی۔ جو گیتا نجلی کے صفحوں پر جگمگاتی ہے۔ اُن کا کہنا تھا رنیش نے اِسے لفظوں کے ہیر پھیر سے سجا کر میرے ماتھے پر چپکا دی ہے۔ پر کوئی پوچھے میں نے اُسے کب کہا تھا کہ وہ مجھے شاہزادیوں جیسے کپڑے پہنائے اور میری گردن کو ہیرے جواہرات سے لاد دے۔ اور پھر میرے لئے یہ لازم ہو جائے کہ اُس سنگھاسن پر جا بیٹھوں بیٹھی رہوں اور نیچے نہ اُتروں اِس ڈر سے کہ کہیں میری پوشاک دنیا کی مٹی سے گرد آلود نہ ہو جائے۔

ٹیگور نے تو ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ اُس نے تو اُس پوشاک کو ہی ناپسند کیا جو انسان کو گرد آلود ہونے سے روکے۔ جو اُسے تکبّر سے بھر دے، جو اُسے عام لوگوں سے ملنے سے روکے، جو اُسے زندگی کے میلے میں داخل نہ ہونے دے۔

میں بھی تو دنیا دار عورتوں کیطرح اُسے اپنے گھر میں۔ اپنے دروازوں میں۔ اپنے آنگن میں۔ اپنے پیڑوں کی چھاؤں میں اور زندگی کی تُو تُو مَیں مَیں میں دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ چُپ ہو گئی تھیں۔ چُپ اُنکے رسیلے گداز ہونٹوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ چھوٹے سے دہانے کو بھی نمایاں کرتی تھی۔

بُہت سالوں بعد اُن سے ملنا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے میری آنکھ اُنکے چہرے کے خدوخال اور اندرونی جذبات کے اُس پر پھیلاؤ کو گہری نظر سے دیکھتی تھی۔

آمنہ سواستک اور ہندو دھرم کی عظمت ہندو جاتی سے قربانیاں مانگتی ہے۔ کوئی اور دے نہ دے اِس مشکل بیڑے کو اُٹھانے کا ذمہ کُلّی طور پر رنیش نے خود لے لیا ہے۔ جدائی میرے لئے کتنی اذیت ناک ہے؟ اِسے سوچنے کی اُسے قطعی ضرورت نہیں۔ میرا جسم اور رُوح فرقت کی آگ میں جل جل کر کیسے راکھ ہوئے جاتے ہیں؟ یہ بھی کوئی پریشانی کی بات

نہیں ۔تنہائی کی ڈستی ہوئی سُولیوں کے پھندے کیسے میرا گلا گھونٹ رہے ہیں؟ اِسے محسوس کرنے اور دیکھنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں، بس مجھے تو قربانی دینے کا حکم ملا ہے۔

''سومیتا دیدی'' میں نے حیرت سے اُنہیں دیکھا تھا۔

''ہاں نا! ٹھیک تو کہہ رہی ہوں ۔'' اور جیسے وہ پھٹ پڑی تھیں۔آنسوؤں کا فوارہ اُن خوبصورت آنکھوں سے پھر بہہ نکلا تھا۔جنہیں میں نے اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے اُنہیں دلداری کے پھیکے رُوکھے لفظوں سے بہلانا چاہا۔

میرے اندر تنہائی کے گہرے گھاؤ ہیں۔میرے ہونٹ مُسکرانا بُھول گئے ہیں کہ وہ کہیں نہیں ہے جو کہا کرتا تھا۔

سومیتا یہ تم ہنسی ہو یا کہیں گھنٹیاں بجی ہیں؟

اُن کا بےقرار دل نہ کہتے کہتے بھی بُہت کچھ کہہ گیا تھا۔

مجھے وہ کلکتہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر لے جانا چاہتا ہے۔شادی کے شروع دنوں میں مَیں بےچین رہتی تھی نا۔''

اور مجھے بُہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ گئی تھیں۔سومیتا دیدی تقسیم کے خلاف تو تھیں نا۔

گھر آ کر میں نے اپنے بھائی سے پُوچھا۔

''پُورے پاکستان میں اُس کے آنے پر پابندی ہے۔''میرے بھائی نے عام سے لہجے میں بات کی۔پر میرے دیور نے اُس کے بخیئے اُدھیڑ دیئے تھے۔

تعجب سے میں نے یہ سب سُنا تھا۔

نریش دادا کلکتے میں بیٹھا تخریبی سرگرمیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ہفت روزہ اخبار شنکھرام کا ایڈیٹر تھا۔اینٹی پاکستانی طلبہ اور لوگوں کا مجیب کے بعد ہر دل عزیز لیڈر رہنا ہوا تھا۔

میرا سُسر ال تو بدنامی کی حد تک پرو پاکستانی مشہور تھا۔ یہ تھوڑی کہ اُنہیں مغربی پاکستان سے شکایات نہیں تھیں۔ ڈھیروں ڈھیر تھیں۔ ضیاء اکثر اپنے فوجی اور کاروباری دوستوں کے لتّے لیتے۔ جی بھر کر انہیں رگیدتے۔ پر وہ علیحدگی کے حق میں ہرگز نہیں تھے۔

کوئی ماہ بعد سومتیا دیدی کا فون آیا۔ مجھے بُہت اصرار سے بُلایا کہ بچے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہیں۔ میں بھی بچوں کے ساتھ آؤں۔ اُن کا اصرار اتنا شدید تھا کہ مصروفیت کے اژدہام میں پھنسے ہونے کے باوجود بھی جانا پڑا۔ سارا دن اُن کے ساتھ گذرا۔ اُن کے دُکھ سُنے۔ اروما اور سوشیل کھُلنے ملنے والے بچے تھے۔

اب ایک طرح آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بچوں کی دوستیاں گہری ہو گئیں۔

پھر ملکی منظر نامے پر بنگالیوں کے جائز مطالبات کے ساتھ ساتھ کہیں اجتماعی اور کہیں انفرادی سطح پر ظلم وستم، قتل و غارت، بربیت کے واقعات رُونما ہونے لگے تھے۔ نوجوان طبقہ بے چینی اور اضطراب کا شکار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آندھیاں چلنے لگیں۔ چھ اور گیارہ نکات پر بحث اور علیحدگی کی باتیں سرعام ہونے لگی تھیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی سیاست کا گڑھ بن گئی تھی۔

مینی انگریزی میں آنرز کر رہی تھی۔ اُروما اور وہ دونوں کلاس فیلو تھیں۔ اروما ایپسو کے پرو انڈیا گروپ کی سرگرم رُکن تھی اور اینٹی پاکستان سرگرمیوں میں اپنے باپ کی طرح بڑی فعال تھی۔ مینی اگر اینٹی پاکستانی نہیں تھی تو کچھ اتنی پرو پاکستانی بھی نہ تھی۔ اپنی ایک واضح سوچ رکھتی تھی۔

''ملک انجانے خطرات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے جیسی سرگوشیاں فضاؤں میں رقصاں تھیں۔ ایسے ہی بے یقینی والے دنوں میں ایک دن مینی نے مجھے بتایا کہ

کمال انتہائی واہیات اور شیطان صفت لڑکا ہے۔ڈپارٹمنٹ کی ہرلڑکی پر رالیں ٹپکاتا پھرتا ہے۔اروما پرتو دل وجان سے عاشق ہے۔خیر وہ تو جوتی کی نوک پرنہیں رکھتی اُسے پر اب مجھے بھی تنگ کرنے لگ گیا ہے۔کسی دن میرے ہاتھوں پٹ گیا تو بابا مجھے کچھ کہیں مت۔''

کمال ضیاء کے لندن میں کوئی بیس سال سے مقیم دوست کا بیٹا تھا جو ڈھاکہ یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ کم اور سیاست دانوں کا آلہ کار زیادہ تھا۔مغربی پاکستان کا جانی دُشمن۔ ہمارے گھر جب بھی آتا ۔ بحث مباحثے میں اِس قدر جذباتی اور مشتعل ہو جاتا کہ کبھی کبھی اُس سے خوف محسوس ہونے لگتا۔ضیاء پر اُسے بہت اعتراضات تھے۔

''مینی اُس کے باپ نے تو تمہارے لئے پروپوزل بھیجا ہے۔''

''کیا؟''

اُس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔چلا کر بولی تھی۔

''اِس اِتنے بڑے ڈھاکہ میں آپ کو میرے لئے کوئی نہیں ملا جو اُس اُچکے کو میرے اُوپر مسلط کرنا چاہتی ہیں۔''

مینی کے انداز پر مجھے بڑی تپ چڑھی تھی۔میں نے غصّے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلاّ چلّی کی کوئی ضرورت نہیں۔ہم نے کون سا اُسے فائنل کر دیا ہے۔''

یہ بھی ایک دن مینی نے ہی کھانے کی میز پر ہنستے ہنستے بتایا کہ اروما آج کل آرمی اینٹلی جنس کے کسی میجر سے بڑی پینگیں بڑھا رہی ہے۔خیال ہے کہ اُس کی پارٹی جیسے اُسے کسی خاص کام کے لئے تیار کر رہی ہے۔کبھی کبھی اُس کے پاس سراغرسانی جاسوسی اور انٹرنیشنل سٹڈیز پر لکھی ہوئی کتابیں نظر آتی ہیں۔گذشتہ ٹیسٹوں میں نمبر کم تھے۔سر زمان نے کلاس میں ہی ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔بڑی جزبز ہو رہی تھی۔

''میرے پاس کب اتنا وقت ہے کہ میں اِنکے نوٹس پر مغز کھپاؤں۔آج کل تو

میں والٹ روسٹو اور سی آئی اے کے ولیم کولبی کو پڑھ رہی ہوں ۔پُراسرار خوفناک، سنسنی خیز اور تھرل سے بھری ہوئی دُنیا سچی بات ہے بندے کی تو سٹی گم ہوتی ہے ۔''

اور خود وہ بھی کوئی معرکہ مارنے کی خواہش مند دکھتی ہے ۔

مینی جب یہ باتیں کرتی تھی ۔میں سوچے چلی جارہی تھی کہ یہ کیسا بدقسمت ملک ہے جسے مخلص لوگ نہیں ملے ۔نالائق سیاست دان، خودغرض اور بے اصولی ویسٹ پاکستانی بیوروکریسی، اقتدار کے بھُوکے جرنیل، جاہل ویسٹ پاکستانی عوام، جوشیلے اور عقل سے عاری پوربو پاکستانی لیڈر اور اُن کے چمچے کڑ چھے طلبہ، مکار اور چالاک ہندو اقلیت جو اوّل دن سے ہی اِسے توڑنے پر در پے تھی ۔

''لو یہ تھوڑے تھے جواب لڑکیوں کو اِن گندے کاموں میں اُلجھا دیا ہے اور اِس اُروما کو تو دیکھو ۔باپ کیا کم تھا جو بیٹی بھی وہی کچھ کر رہی ہے ۔''

میرے اندر نے دُکھ اور تاسف سے بھری لمبی آہ باہر نکالی تھی ۔

ایک پل کے لئے میرا جی چاہا کہ میں سومیتا دیدی سے بات کروں ۔لڑکی ذات ہے کسی بڑے خطرے میں نہ گھِر جائے ۔پر حالات کی گھمبیرتا اور اُس کا افسوس ناک بہاؤ مجھے خاموش رہنے کی تلقین کرتا تھا ۔سو میں چُپ رہی ۔

اور آج میں یہ خبر سُن رہی تھی ۔

میری ابتر حالت کے پیشِ نظر مینی میرے پاس بیٹھ گئی ۔

''ماں اگر آپ اپنے پُرکشش چہرے پر سجے اظہارِ افسوس کے اِس پچ پچ جیسے پوسٹر کو تھوڑی سی دیر کے لئے نوچ کر پھینک دیں اور مجھے سُنیں تو شاید یہ چیز آپ کے ڈوبتے دل کے لئے زیادہ تسکین کا باعث ہو گی ۔

وہ تو گئی شکار کرنے تھی ۔مینی اُس کے ساتھ گذرے دنوں میں چلی گئی تھی امریکن

لٹریچر کی کلاس میں میرا انہماک سر سوبھاش چندر کے ارنسٹ ہیمنگوے کی
THE OLD MAN AND THE SEA. پر تجزیاتی لکچر سُننے میں پوری شدت سے موجود تھا۔ کلاس کی آخری نشستوں پر ہم دونوں کو پاس پاس بیٹھی تھیں پر اُروما کس حد تک کلاس میں تھی۔ یہ میں نہیں جانتی تھی۔

پھر جیسے کوندا سا لپک جائے والی بات ہوگئی تھی۔ اسکے ہاتھ میں ایک تصویر تھی اور میری ساری توجہ اور انہماک جیسے ہوا میں دھویں کی طرح تحلیل ہوگیا تھا۔

نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا تھا۔ قدو قامت سے لے کر نقش و نگار ساتھ مردانہ وقار اُوپر سے ملٹری یونیفارم سونے پر سہاگہ شاید اسی کا نام ہے۔

میں نے اِسے پہچانا ہے۔ انٹیلی جنس کا میجر بڑی توپ شے ہے۔

میں بظاہر سر سوبھاش چندر کے ہلتے ہونٹ دیکھتی تھی، پر وہ کیا بول رہے تھے، میری سماعت گویا بہری ہوگئی تھی۔

''کہاں ملا تھا؟'' میں نے تصویر پر ایک بار پھر نظریں گاڑ دی تھیں۔ رشک بھی محسوس ہوا تھا اور حسد بھی۔

''نمک بازار میں۔ سائیکل رکشے والے نے پھڈا ڈال دیا تھا۔ اُس سے جھگڑ رہی تھی۔ یہ گاڑی میں وہاں سے گذرا۔ رُکا۔ لفٹ دی۔ شاہ باغ میں چائے کا ایک کپ پینے کی آفر کی۔''

اور نوٹس کاپی پر تیزی سے چلتے پن نے پہلی پہلی ملاقات کا احوال سُنا دیا تھا۔

میرے لئے یہ بات تھوڑی سی حیران کرنے والی تھی کہ جب اُس نے کلاس ختم ہونے پر کہا تھا۔

''یہ تو بلی کے بھاگوں چھنکا ٹوٹے والا کام ہوا ہے۔ ٹیسٹ کیس سمجھ لو۔ 1967

میں عرب اسرائیل جنگ میں جو کردار یہودی عورتوں نے مصری فوجیوں کے ساتھ کیا تھا کچھ ویسا ہی کرنے کا میرا ابھی ارادہ ہے۔''

پر ہوا کچھ یوں۔

کہ اس میدان کی وہ ناتجربہ کار کھلاڑی تھی۔اسکے ہاں بڑھکیں ضرور تھیں پر دارجلنگ اور شیلانگ کے کونونٹوں میں تعلیم پانے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کی منفی سیاست میں ملوث ہونے کے باوجود اُس میں مشرقی خوبو بھی تھی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے متاثر ہونے کا جذبہ بھی موجود تھا۔

اور وہ میجر تو کردار کا مجاہد تھا۔ایک کردار کی مضبوطی دوسرے بڑی پسندیدہ عادات واطوار گویا دو آتشہ والی بات اور سہ آتشہ یہ کہ اُروما سے گہرا پیار۔

اب بھلا شکار کیسے نہ ہوتی۔شکار تو اُسے ہونا ہی ہونا تھا۔ہوئی اور یوں ہوئی کہ اُس نے تو صاف صاف کہا۔

''میں میں تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ میں نے اپنا دھرم،گندی سیاست، زبان،کلچر،تہذیب سبھی ایک پوٹلی میں باندھ کر بوڑھی گنگا بُرد کر دیئے ہیں۔

مزے کی بات اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپایا۔سب کچھ اُسے بتادیا اور میجر نے اُس کی ساری باتوں کے جواب میں اُس کا ماتھا چوما اور بس اتنا کہا۔

''تم جو کچھ بھی تھیں وہ تمہارا ماضی ہے۔مجھے اِس سے کوئی سروکار نہیں۔میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے۔''

اور سچ صرف اتنا ہے کہ اُروما کسی پکے پھل کی طرح اُس کی گود میں جا گری تھی۔ وہ چاہتا تو رَس چوس کر پھوک پھینک دیتا۔پر نہیں۔ماں ایسی ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک ہے کہ اگر کہیں اُس کی جگہ میں ہوتی تو میں نے بھی بھاگ جانا تھا۔

''کچھ شرم کرو مینی۔'' میں نے ڈپٹا۔

''فارگاڈ سیک یہ اتنی کنزرویٹو باتیں مت کیا کریں۔''

''ہاں تو اور سُنیں۔'' مینی نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

کلمہ اُسے میجر توصیف نے ہی پڑھا دیا تھا۔نام ایمان بھی اُسی نے رکھا۔پر اُسے لینے کے لئے اُس کا پورا خاندان آیا۔ماں، بہنیں، بہنوئی اور بھائی۔

مُستقبل کسی نے نہیں دیکھا پر جو کچھ سامنے ہے قیاس اُسی پر کئے جا سکتے ہیں۔اروما بجنت ورہے۔میجر اور اُس کے گھر والے بُہت سادہ اور محبت والے لوگ ہیں۔

میجر کے بھائی اور بہنوئی اُروما کی طرف سے شامل ہوئے۔اُس کی بوڑھی ماں نے لاہور میں بیس مرلے پر اپنا خوبصورت گھر اُس کے حق مہر میں لکھوایا۔نکاح کے بعد اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا۔

''جو میری عمر بھر کی پونجی تھی وہ میں نے تیرے قدموں میں ڈال دی ہے تا کہ تجھے کبھی عدمِ تحفظ کا احساس نہ ہو۔''

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر میرا اندر مضطرب اور بے کل سا تھا۔سومیتا دیدی کے دُکھ اور اُداسی کے کتنے رنگ میرے سامنے تھے جو اُکساتے تھے کہ مجھے ابھی اور اِسی وقت اُٹھنا اور اُن کے پاس جانا چاہیے۔میں اُٹھی بھی، تیار بھی ہوئی، پھر بیٹھ گئی۔ایسا ڈپریشن تھا کہ جیسے کسی عزیز کی موت ہو گئی ہو۔

پر تیسرے دن جب دوپہر نے ابھی سہ پہر کے گرد اپنا آخری چکر پورا ہی کیا ہوگا میں اُن کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور نوکروں سے یہ جانی تھی کہ وہ اِس وقت پُوکھر (تالاب) پر ہیں۔میں وہیں چلی گئی تھی۔

اُس وقت گلابی جل پر دُھوپ میں چمکتے تھے۔پُوکھر کے کنارے کنارے پھیلی

جل بیل خوبصورت لگتی تھی ۔سبزی مائل پانی ہواؤں کے زور سے کسی نازنین کے بالوں میں پڑے لہروں جیسے ڈیزائن بناتا تھا۔

وہ ڈوُ کھ رکنارے بیٹھی تھیں۔ میں قریب جا کر کھڑی ہوئی مگر وہ متوجہ نہیں ہوئیں۔ پتہ نہیں کہاں تھیں۔بظاہر پانیوں پر گہری نظریں جمائے۔شاید وہ اِن پانیوں میں ماضی کی کچھ یادوں کے عکس اور اُن کے رنگوں کو دیکھ رہی تھیں جو شوہر اور بیٹی کی صورت کبھی یہاں بکھرتے تھے۔

میں نے پکارا تھا۔ ''سومیتا دیدی۔''

پہلی بار تو میری اپنی آواز حلق کے کنوئیں سے جیسے مرتے دھرتے نکلی تھی۔جو خود میری سماعت میں نہ آئی۔

دوسری بار بول اُونچے تھے پر وہ بھی اُنہیں متوجہ نہ کر سکے تیسری پکار پر انہوں نے میری طرف دیکھا۔مجھے لگا جیسے میرا کلیجہ ابھی کٹ کر ٹکڑوں کی صورت میرے پاؤں میں آگرے گا۔آنسواُن کے بھی ذبح ہوئے بکرے کی گردن سے دھائیں مارتے خون کی طرح بہہ نکلے تھے اور میرے بھی۔میں نے اُنہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔میرے کندھے پر دھرا اُنکا سر گھائل ہو کر تڑپتا اور وجود ہچکولے کھاتا رہا۔

''آمنہ۔''

بہت دیر بعد انہوں نے سر اُٹھا کر روئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور تڑپتے ٹوٹتے لہجے میں کہا تھا۔

مینی کو معلوم تھا۔وہ ہمیں بتا تو سکتی تھی۔میں اُس کے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیتی۔گھر کی دیواروں کو آسمانوں تک اُونچا کر دیتی۔اُسے کمرے کی تنہائی میں مار دیتی پر اپنے سامنے تو مارتی۔

میرے اللہ اُن کا بلکنا اُنکا تڑپنا مجھ سے دیکھا نہیں جا تا تھا۔سنبھالنا مشکل ہوگیا۔
گذشتہ دو دنوں سے وہ اِسی حالت میں تھیں ۔تسلی کے بول بولنے بڑے مصنوعی سے لگ
رہے تھے۔

دلداری کروں تو کیسے؟سمجھاؤں تو کیونکر؟تسلی کیسے دوں؟یہ کوئی نرالا اور انوکھا تو
تھا نہیں کہ مثالیں ملنی مشکل ہوتیں ۔عزیزوں ، ملنے ملانے والوں،گلی کوچوں ، پرنٹ میڈیا
کے ذریعے شہروں ،ملکوں اور اِس سے بھی پرے تاریخ کے صفحات میں ڈھیر لگے پڑے
تھے ۔ہاتھ ڈالو،حسبِ حال اور موقع محل کی مناسبت سے مواد نکال لو۔
پر پتہ نہیں کیوں مجھے یہ ساری کاوشیں بڑی بے معنی نظر اور انتہائی فضول سی نظر
آئیں میں نے اُنہیں بصد اصرار تھوڑا سا بھات کھلایا تھوڑی سی چائے پلائی ۔سر میں تیل
ڈالا ۔مالش اور کنگھی کی۔ساڑھی بدلوائی ۔پر میرے ہونٹوں پر تسلی سے بھرا کوئی لفظ نہ اُبھر
سکا۔

رات کو جب رُخصت ہونے کی اجازت چاہی ، اُنہوں نے میرا ماتھا چُومتے
ہوئے کہا۔

''آمنہ مِنی کا خیال رکھنا۔اُسے خطرہ ہے۔کمال عبداللہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''سومیتا دیدی کمال عبداللہ ضیا کے دوست کا بیٹا ہے۔اُس کا باپ مِنی کے لئے
خواہش مند ہے۔

آمنہ میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں؟''

اُن کی ویران آنکھوں میں کچھ تھا۔میں لرز اُٹھی ۔

گھر واپسی کا راستہ کیسے کٹا؟ میں نہیں جانتی تھی ۔اپنے کمرے میں جانے کے
لئے ابھی راہداری میں تھی کہ جب مِنی کے کمرے سے آتی آواز نے قدموں کو روک دیا۔

میں اِس آواز کو پہچانتی تھی۔ جیوتی تھی یہ۔ مینی اور ارو ما کی دوست۔ کمال عبداللہ کی پارٹی کی جنرل سکریٹری۔

''اُف زخمی سانپ کی سی کیفیت میں ہے وہ۔ بس گھولتا، بل کھاتا، گھونٹ گھونٹ جن پیتا، تمہیں گالیاں نکالتا، کلکتے کے نکسل باڑی غنڈوں سے اُٹھوانے کے منصوبے بناتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتا۔

''میرے من کی شانتی تھی وہ۔''

میں نے تو کہا۔

''ڈوب مرو کسی پُوکھر میں جا کر۔ کس منہ سے کہتے ہو شانتی۔ اور وہ شانتی تمہاری چھاتی پیٹتی، تمہاری آنکھوں میں دُھول ڈالتی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

''حرامزادہ۔'' مینی نے منہ بھر کر گالی نکالی تھی۔

''صورت نہیں دیکھتا اپنی؟ جتنا کوڑھی کرتوت اُس سے زیادہ کوڑھے۔ اروما کے باپ کا پتہ نہیں کیسا لاڈلا بنا ہوا ہے؟ نفرت ہے مجھے اور دیکھو اُس کا باپ میرا رشتہ چاہتا ہے۔''

اُروما کا نکاح اور اُس کا پچھپی پاکستان چلے جانا ہمارے لئے قہر بن کر آیا۔ کمال ہمارے گھر آیا۔ وہ دھاڑ رہا تھا کسی مست سانڈ کی طرح۔ کون سی گالی تھی جو اُس نے ہماری بیٹی اور ہمیں نہ دی۔ مینی کو غنڈوں سے اُٹھوانے کی دھمکیاں تھیں۔ ضیاء اور میں نے اُس کے باپ سے دوستی کے ناطے منت سماجت کرتے ہوئے اُس کے غصّے کو زائل کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور ہمارا خیال تھا ہم اُسے ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو یقیناً ہماری بھول تھی۔

ملک کی بدقسمتی اور منحوسیت دھیرے دھیرے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ رہی تھی۔

ایسے ہی بے رحم دنوں میں ہمیں وہ منحوس خبر ملی جو مینی کے اغوا سے متعلق تھی۔اب فوج کی مدد ضروری تھی۔رات کے تیسرے پہر جگن ناتھ ہال پر اچانک ریڈ ہوئی۔دونوں طرف سے دھواں دھار قسم کی فائرنگ اور اس اپریشن کے نتیجے میں کمال مارا گیا۔

اُس کے مرنے پر اگرچہ ہم نے سُکھ کا سانس لیا تھا پر ہم اب شر پسندوں کی ہٹ لسٹ پر آ گئے تھے۔پر وپاکستانی ہونے کا کلنک تو ہمارے ماتھوں پر پہلے ہی سجا ہوا تھا۔

انتخابات کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ اپنے عُروج کی طرف بڑھنے لگیں۔ہمارے دلوں میں، ہمارے ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔بہتری کی، سلامتی کی، ملکی بقا کی۔پھر یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔اچھے اور منصفانہ انداز میں۔

پر مصیبت تو یہ تھی کہ اکثریتی پارٹی کو اُس کا حق نہیں دیا جا رہا تھا۔ایک طرف ہمارے لئے یہ بات سُوہان رُوح تھی کہ آخر اقتدار کی منتقلی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟فوج اور ویسٹ پاکستانی لیڈر سب حرامزدگی پر اُترے ہوئے تھے۔محلاتی سازشوں کے تانے بانے حالات کو انتہائی بھیانک سمتوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔

''آمنہ نکل جاؤ یہاں سے۔'' سومیتا دیدی مسلسل فون کئے جاتی تھیں۔

آدھی سُسرال باہر جا چکی تھی۔میکہ مُصر تھا کہ فکر کی بات نہیں ہم جو ہیں۔ہم بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے خود کو بلی سے محفوظ سمجھے بیٹھے تھے۔لیکن زیادہ وقت بھی نہ گذرا تھا کہ نوشتہ دیوار ہمارے سامنے عین واضح ہو گیا تھا۔گھر پر حملہ ہوا۔قدرت کو زندہ رکھنا تھا۔تن والی ساڑھی کے ساتھ بھاگے۔سومیتا دیدی نے بازو کھولے اور ہمیں سمیٹ لیا۔

کیسی وحشت بھری رات تھی۔اپنی زمین اپنی جنم بھومی بے مہری پر اُتر آئی تھی۔پُوربو پاکستان کا کون سا شہر تھا جو ہمارے آبا ؤاجداد کی ہڈیوں سے بھرا ہوا نہ تھا۔مگر حالات کے جبر نے سب کچھ کتنا اجنبی اور غیر محفوظ کر دیا تھا۔ضیاء نے لمبا سانس بھر کر باہر

آسمان کو دیکھا تھا۔ کہاں جائیں؟ اب تو سارے راستے جیسے بلاک ہو گئے تھے۔

کتنا بڑا جگرہ تھا اُس عورت کا۔ کمال رازداری سے اپنی وسیع و عریض باڑی میں کئی دن رکھا اور یہیں سے نیپال اپنے بھائی کے پاس پہنچا دیا۔

اِسی دوران ملٹری آپریشن شروع ہو گیا تھا۔ ظلم و ستم کے نئے باب رقم ہونے لگے اور ہوتے چلے گئے۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ملک دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ وقتِ پیغمبری پڑا کہ جس نے انسانیت کے پرخچے اُڑا دیئے۔ زمین انسانی خون سے اسوک کے پھولوں جیسی سُرخ ہو گئی تھی۔ انسان درندوں کا روپ دھار بیٹھے تھے۔

جب نفرت اور تعصب کی خونیں آگ قدرے بُجھنے لگی۔ ہم لوگ لوٹے۔ یہ ضیاء الرحمٰن کی حکومت کا ابتدائی دور تھا۔ ضیاء الرحمٰن ضیاء کے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ سب کچھ لُٹ لُٹا گیا تھا۔ گھر ضرور بچا تھا۔ پر اس میں تھا کیا؟ ہماری یادوں کے مدفن۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور بین ڈالنے کو جی چاہ رہا تھا۔ زندگی صفر سے شروع ہو رہی تھی۔ بیٹی بیاہنے کی موزوں عمر سے باہر نکل آئی تھی۔ غریب الوطنی میں کیا کرتے؟ جانیں اور عزتیں بچ گئی تھیں جو بہت غنیمت تھیں۔

سومیتا دیدی جیسی مہان عورت سے ڈھاکہ خالی ہوا پڑا تھا۔ اپنے نیپال قیام کے دوران جس باقاعدگی سے میں نے اُنہیں خط لکھے شاید میں نے اپنے کسی عزیز کو بھی نہ لکھے ہوں گے۔ وہ بھی مجھے جواب دینا یاد رکھتیں۔ حوصلہ بڑھاتیں کہ وقت ضرور مشکل ہے۔ پر تم دونوں ساتھ ساتھ ہو۔ یہ دوسرا تھ مُشکلوں کو مُشکل نہیں رہنے دے گی۔

اُن کے سارے خط میں نے بہت سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آج پرانے کاغذات دیکھنے بیٹھی تو بیچ میں سے دیدی کے خط نکل پڑے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انہیں پڑھنے بیٹھ گئی۔

تمہارے کم وبیش ہر خط میں ایک چھوٹی سی درخواست، ایک التجا ہے، آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ۔دیدی اگر برا لگے تو معاف کر دیجیے گا۔جیسے استفہامیہ عنوان یا سرخیاں پر اِن سے متعلق نفسِ مضمون تمہاری تحریر میں کہیں نہیں ۔تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ جس کے لئے تمہیدیں باندھ رہی ہو۔کوئی دوسرا پڑھے تو یہی سمجھے۔پر میرے لئے سبھی روز روشن کی طرح واضح ہیں ۔اُسی طرح جب تم ڈھاکہ میں تھیں ۔میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک تمہارے ہونٹوں پر لرزتے کانپتے چند الفاظ تو ضرور اُبھرتے، پر شاید میرے جامد چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے وہ دم توڑ دیتے ۔تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں ۔میرے لئے اُسے سمجھنا دُشوار نہ تھا۔

آمنہ اروما کو میں نے بیٹی نہیں اپنی سہیلی کے رُوپ میں دیکھا تھا۔جب وہ چھوٹی سی تھی اور رنیش کلکتے میں ۔ششمیتا دیدی کا نیپال سے ایک دن فون آیا۔میں بھری بیٹھی تھی ۔بلک بلک کر رو دی۔

اُنہوں نے کہا۔پاگل ہو۔بھگوان نے تمہیں سہیلی دے دی ہے ۔ذرا بڑی ہونے دو اُسے ۔تمہاری تنہائی کا روگ کٹ جائے گا۔پر رنیش نے میری یہ سہیلی بھی مجھ سے چھین لی ۔میں نے بہت کہا۔ہولی کراس کونونٹ ڈھاکہ میں بھی تو ہے۔

"نہیں نہیں سومیتا" ہمیشہ کی طرح اُس کی آواز میں اپنی بات منوانے والی ہٹ دھرمی تھی ۔شیلانگ کے کونونٹ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جونیر کیمرج کے بعد دارجلنگ سے سینئر کیمرج کرے گی۔یوں سینئر کیمرج کے بعد وہ ڈھاکہ آگئی ۔

اُروما مجھ سے بہت پیار کرتی تھی ۔پر بے تکلف نہ تھی ۔اُس نے مجھ سے اِس معاملے پر کوئی بات ہی نہیں کی اور چلی گئی اور میں اُسے یہ بھی طعنہ نہ دے سکی کہ کلچر، دھرم اور بھاشا کا فرق بہت سے دُکھوں اور دردوں کو جنم دیتا ہے ۔تم کہاں کہاں اُن کے آگے ایک

آدمی کی محبت کا بند کھڑا کروگی۔

آمنہ دوپہر ڈھلنے لگتی تو انجانے میں نظریں بیرونی پھاٹک کی کھڑکی پر جم جاتیں۔ یوں لگتا جیسے ابھی یہ کھُلے گی اور اروما کھِل کھِل کرتی اندر آجائے گی۔

کان بجتے۔ ''ماں ماں کہاں ہوتم؟'' جیسی آوازیں تعاقب کرتیں۔

میں تو بھگوان کا یہ بھی شکر ادا کرتی کہ باپو کی یادداشت نہیں رہی تھی۔ میں رنیش کے جذبات سے تو لاعلم ہی رہی کہ اُس نے ذاتی دُکھ کبھی میرے ساتھ شیئر کرنے کی عادت ہی نہیں ڈالی تھی۔ ہاں البتہ رشتہ داروں کی باتیں سوہان رُوح ضرور تھیں۔

یہ کوئی پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہیلو کہا۔ دوسری طرف ہیلو کہنے والی اروما تھی۔ میں نے فون بند کر دیا۔ گھنٹیاں بجتی رہیں اور میرے آنسو بہتے رہے۔ پھر ہر روز کا معمول ہو گیا۔

اِدھر گھڑیال کی سوئیاں گیارہ اور بارہ پر آئیں اُدھر میرے فون کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ بجتیں، بند ہوتیں۔ یہ چکر پورے ایک بجے تک چلتا۔

ایسے ہی دنوں میں مینی بھی میرے پاس آئی تھی۔ وہ روتی تھی۔ اُس کی وکالت کرتی تھی۔ مجھ سے کہتی تھی۔ آپ اُسے معاف کر دیں۔

میرے ہونٹوں پر چُپ تھی۔ ایک نہ ٹوٹنے والی چُپ اور وہ تھک ہار کر چلی گئی۔ یقیناً تمہیں اِس کا علم ہوگا۔ مگر جاتے جاتے بہت سارے خط مجھے دیتی گئی۔ وہ خط جو وہ مینی کے نام پر بھیجتی تھی اور جو میرے لئے تھے۔ میں نے انہیں اُٹھائے اور ڈسٹ بن میں ڈال دیئے۔

پر یہ کیا! آمنہ میں تو جیسے بے کلی کی سان پر جا چڑھی تھی۔ اندر باہر کے چکر شروع ہو گئے۔ کبھی کوئی کام کرتی۔ کبھی کوئی۔ پر اپنا دھیان بٹانے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ میری

نظریں بار بار کونے میں دھری ٹوکری کی طرف اُٹھتیں، واپس لوٹتیں۔

جب رات پڑ گئی میں لیٹ گئی۔ آنکھوں پر یونہی پپوٹے گرا لئے۔ اگلی صبح کا منظر سامنے تھا۔ چندن کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ایک ایک بات کا دھیان رکھتا ہے۔ ان ڈھیر سارے خطوں کو دیکھ کر پُوچھنے آئے گا۔

''بی بی یہ تو پتر ہیں۔ انہیں کوڑے میں پھنک دوں کیا؟''

''منہ پرے کرتے ہوئے میں کہہ بھی دوں کہ ہاں ہاں پھنک دو۔'' پر کہیں میرا لہجہ بھیگا ہوا ہوگا۔ میری آنکھوں میں نمی اُتر رہی ہوگی۔

یہی سب تو میں اروما سے چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرے۔ اپنے اندر کو میرے ساتھ بانٹے۔ اب وہ بانٹنے لگی تھی تو کیسی خلیج بیچ میں حائل ہوگئی ہے۔ اور پھر مجھ سے رہا نہ گیا میں اُٹھی۔ میں نے خط نکالے اور پڑھے بغیر دراز میں رکھ دیئے۔

ہاں تو آمنہ ایک دن اُس کا فون نہیں آیا۔ یہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا۔ اور دیکھو ذرا میرا اندر جیسے چیخنے لگا۔ کیوں؟ کیوں نہیں، کیوں نہیں کیا اُس نے فون؟ میں خود سے کہتی۔ اندر باہر ایسا گھمسان کا رَن پڑا کہ میرے شریر کی ہر زخمی بوٹی کا منہ کھُل گیا اور خون فوارے کی طرح بہنے لگا۔ میں نڈھال بستر پر پڑ گئی۔

کوئی دس دنوں بعد اُسی مخصوص وقت پر فون کی گھنٹی بجی۔ کس بیتابی سے میں نے اُٹھایا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت تھی۔

اروما تھی۔ اُس کا شوہر تھا۔ اُس کا دس دن کا بچہ تھا۔

آنسوؤں میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ تھے۔ پھر یہ معمول بنا۔ کبھی میں اُن تینوں کی، کبھی ماں بیٹے کی اور کبھی اروما کی آوازیں سنتی۔ اُن سے باتیں کرتی۔ میری راتیں اُس کے خطوں سے بہلنے لگیں۔ میں خط نکالتی اُسے پڑھتی۔ وہ تو اب میری سہیلی بنی تھی۔ جب

رابطوں میں گڑ بڑ ہونے لگی۔فون بند ہو گئے تو لندن کے راستے خط آنے لگے۔اور آمنہ جانتی ہو۔میں نے کتنی بار بھگوان سے اُن شہروں کی خیر مانگی جہاں میری ارو ماتھی ،اُس کا بیٹا سلمان تھا۔پھر خطوں میں بھی تعطّل آنے لگا۔

یہ اُداسیوں اور ویرانیوں میں لپٹی دسمبر کی ایک سردی سہ پہر تھی۔وہ اپنے وسیع وعریض گھر میں داخل ہوا تھا۔میں اُس وقت آنگن میں آرام کرسی میں دھنسی ہڈیوں کی مُٹھری بنی آنکھیں بند کئے دُھوپ میں بیٹھی تھی۔کوئی آیا تھا۔کوئی میرے پاس کھڑا تھا۔کوئی مجھے دیکھتا تھا۔

ایک دُھواں دُھواں ساچہرہ میرے اُوپر جھکا اور بولا۔

''سویتا آنکھیں کھولو۔میں آیا ہوں۔اُس وچن کے ساتھ کہ تم کلکتہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر جاؤ گی۔''

میں نے آنکھیں کھولیں۔اپنے سامنے کھڑے اُسے دیکھا۔

''رنیش۔'' کتنا عام سا لہجہ تھا میرا۔رنیش کہنے میں نہ اندر سے محبت کی گرمی دہکی تھی، نہ چاہت کا کوئی انداز ظاہر ہوا تھا۔یوں ٹکٹکی لگائے دیر تک اُسے ایسے ہی دیکھا جیسے بالمقابل کوئی اجنبی کھڑا ہو۔پھر ہونٹوں نے کہا۔

''بڑے مُورکھ ہو۔پیٹ اور جگر کے رشتوں میں فرق ہی نہیں جانتے۔بھلا جگر کے رشتے سے آگے کون؟ پاسپورٹ اور ویزا کے نئے چکر شروع کروانے میں تم نے اپنی حیثیت کے مطابق اپنا حصّہ ڈال کر ممتا کے کلیجے پر چھری چلا دی ہے۔میں تو اب من چاہنے پر اپنا اٹیچی کیس اُٹھا کر کبھی پاکستان نہ جاسکوں گی۔''

اوغزہ کے بچو

دن جُمعے کا تھا۔جگہ شہرِ دمشق کی قدیم ترین دمشق سیٹڈیل
Damascus Citadel تھی۔جہاں اُس اُموی خلیفہ ولید بن عبدالمالک کا شاہکار اُمیّہ مسجد ہے۔عین سامنے جس کے وہ ساحتہ المسکیہ کا میدان قدامت کی فسوں خیزی لیئے قلب ونظر کوحیرت زدہ کرتا ہے۔آج تیسرا دن تھا۔میں ہر روز دمشق کے محلوں،عجائب گھراوراُس کے کوچہ بازاروں میں گھومتی پھرتی یہاں آجاتی۔

پہلے دن ہی اس کی سحر انگیزی نے مجھے جکڑ لیا تھا۔کینا کے درخت تلے بیٹھی خوشگوار ہواؤں سے لُطف اندوز ہوتی کبھی اپنے دائیں ہاتھ نوادرات کی دوکان کے چوبارے کی آبنوسی کھڑکیوں کودیکھتی جن کی چوبی کندہ کاری ایسی گھتی ہوئی تھی کہ نگاہیں اُن میں پھنس پھنس جاتیں۔سامنے دمشق کے مشہور حمیدیہ بازار کے اختتامیہ حصّے پر بنے حداد (Hadad) ٹمپل کے کالم ٹوٹ پھوٹ اور خستگی کا شکار ہونے کے باوجودنظروں کو لُبھاتے تھے۔پُشت پر اُمیہ مسجد کا پندرہ سولہ فٹ اونچا دروازہ، بلند و بالا دیواریں اوراس کے تین

مختلف سٹائل کے بنے مینار اس کی عظمت کے گواہ تھے۔

اس جمعے کے دن میری نگاہیں پتھر کے فرش سے پھسلتی کھجور کے صدیوں پرانے درخت کی جھالروں سے آنکھ مٹکا کرتی، پھڑ پھڑاتے کبوتروں کی اڑان میں اُلجھتی، اُس لڑکی سے جا ٹکرائی تھیں جو خوبصورت تو ضرور تھی پر ایسی نہیں جیسا شامی حُسن ہوتا ہے کہ بندے کو جکڑ لیتا ہے۔

سادے سے سفید سُوتی سکارف سے ڈھانپے سَر کے نیچے چہرہ دھوپ میں تمتما سا رہا تھا۔ لونگ سکرٹ ٹخنوں کو چھوتا تھا۔ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے اُسے گھسیٹ سی رہی تھی وہ سو فیصد یورپی نظر آتا تھا۔

جمعہ کی پہلی اذان ہو چکی تھی۔ چبوترے سے اُتر کر میں میدان میں مسجد کے دروازے کی سمت رواں تھی جب اُس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

"مَردوں کیلئے مسجد جانے کا کون سا راستہ ہے؟"

"یہی جو تمہارے سامنے ہے۔"

جب وہ دونوں باب بُرید سے گزر رہے تھے میں ان کے پیچھے تھی۔ لڑکا مردانے حصّے کی طرف بڑھنے لگا تو لڑکی نے انگریزی میں اُس سے کہا تھا۔ "نماز کے بعد ایک دو گھنٹے آرام کر لینا۔"

اب وہ وضو کیلئے کدھر جانا ہے؟ جیسا سوال کرتی میرے ساتھ ہو لی۔

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے میری نظروں کا بھٹکاؤ تو بس لمحوں کا ہی تھا۔ میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے بائیں ہاتھ کی بلند و بالا دیواروں پر آرٹ کے فطرت سے متعلق صدیوں قدیمی شاہکاروں پر نظریں ڈالے بغیر آگے بڑھ جاتی۔ دارالخزانہ جیسے شاہکار سے آنکھیں چُرا کر اپنا راستہ ناپتی۔ سچی بات ہے یہ تو سَراسَر اُس کی توہین تھی اور صحن میں بنا

چوکور مینار بھی ہرگز دیکھے بغیر گزر جانے والا نہ تھا۔

میں خود پر لگنے والے اِس اعتراض کو سُننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ گزشتہ تین دنوں سے ہر روز ان کے نظاروں سے محظوظ تو ہو رہی تھیں۔ اب کیا انہیں گھول کر پی جانا تھا۔

بھئی سچی بات ہے میں بھی اپنی بھُوک اور حریصانہ نظروں کے ہاتھوں مجبور ہوں جو اِس آنکھ مٹکے سے باز رہ ہی نہیں سکتیں۔ جب گردن سیدھی کی لڑکی غائب تھی۔

"ارے"

بھونچکی سی ہو کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ چکر کھا کر پُشت اور سامنے نگاہ کی۔ لڑکی تو کہیں نہیں تھی۔ آنکھوں کو ٹمٹماتے میں نے تاسف سے پھر ارد گرد کا یوں جائزہ لیا کہ جیسے وہ لڑکی تو نہیں سُوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ میں پہنی بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی گر گئی ہے۔

لڑکی کہاں تھی۔ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے راستہ پوچھتی تھی وہ سو فیصد یورپین تھا۔ جھلاتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

" کیسی بے حس لڑکی تھی۔ پہلی بار اِس نادر تاریخی ورثے میں داخل ہوئی اور پَل بھر کیلئے رُک کر کسی چیز پر نظر نہیں ڈالی۔ کچھ سوچا بھی نہیں کہ جہاں سجدہ کرنے آئی ہے وہ زمانوں قرنوں سے جائے عبادت تھی آرمینائیوں، رومیوں، عیسائیوں اور اب مسلمانوں کی۔ یہ تاریخ کے کتنے بے شمار باب کھولتی ہے۔ اُس نے کسی کو بھی کھولنے یا پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

پتمسہ کا حوض تو ابھی بھی سامنے موجود تھا۔

اب افسوس اور جھلاہٹ کا فائدہ۔ کہانی تو مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔ سُست قدموں سے وضو والے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں بھی دھیان

وضو میں کم اور لڑکی میں زیادہ رہا۔

ابھی تو خطبہ جاری تھا۔سامنے والے حصّے کی طرف بڑھنے لگی کہ چلو وہاں سجدہ بھی ہوگا اور نظارہ بھی۔مسجد کا وسیع و عریض پختہ صحن تنور بنا پڑا تھا۔چھاؤں والے حصّوں میں عورتیں پھسکڑے مارے بیٹھی تھیں۔ذرا اُن سے بچتے دھیان سے آگے بڑھتی تھی کہ کسی کا ہاتھ کسی کی انگلی پاؤں کے نیچے آگئی تو سیاپا پڑ جائے گا۔تبھی کسی نے عبا کھینچی۔پلٹ کر دیکھا تو بند دروازے کے آگے بنے پوڈے پر لڑکی بیٹھی تھی۔

خوشی سے نہال ہو جانے والا معاملہ ہوا تھا۔میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہی اُسے اپنی کیفیات سے آگاہ کیا۔

"سوری۔دراصل ایک خاتون پر مجھے سلفیٹSulfit فلسطین میں اپنی ہمسائی کا گمان گزر را تھا۔بھاگی تھی کہ اُسے پکڑلوں کہیں ہجوم میں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔پر وائے حسرت وہ تو کوئی لبنانی نکلی۔

تو وہ فلسطین سے ہے۔اور وہ لڑکا کون تھا۔

اندیشے سَرسَر کرتے لہجے میں دوڑتے چلے آئے تھے۔

لڑکی تو بڑی میٹھی سی اور بڑی پیاری سی دِکھتی ہے۔ہائے اللہ کوئی رولے غولے والا چکر تو نہیں۔

"بس کر۔وڈی مولون۔"

ایسی پھٹکار کے باوجود پوچھ ہی لیا۔لڑکا کون تھا؟

"میرا شوہر ہے۔"چلو اطمینان تو ہوا۔پر سوال پھر ہوگیا کہ وہ تو یورپین لگتا ہے۔

"ہاں نا۔برٹش ہے۔اسلام قبول کیا ہے اُس نے۔"

پُوٹی جیسے ہاتھ کو بے اختیار ہی تھام کر چُوم لیا۔دھان پان سی لڑکی نے بڑا کارنامہ

سرانجام دیا تھا۔اوپر سے ترقی پسندی کی جتنی بھی ڈینگیں ماروں اندر سے مسلمانیت پھر بھی پلّہ مارجاتی ہے۔

نماز کیلئے عورتیں صف بندی میں مصروف ہوئیں تو میں اُس کا ہاتھ تھام کر باب جیرون میں داخل ہوئی۔یہیں قریب ہی مشہد الحسین ہے۔روایت ہے کہ عالی امام حسین کا سر مبارک یہاں دفن ہے۔

لڑکی نے چلتے چلتے رُک کر پوچھا تھا"سنا ہے حضرت یحییٰ علیہ اسلام کا روضہ مبارک بھی یہیں ہے۔

"ہاں محراب کے پاس ہی ہے۔پچی کاری کا بڑا خوبصورت کام ہے اُس پر۔"

فرش خوبصورت دبیز قالینوں سے ڈھپے ہوئے تھے۔جن پر ساتھ ساتھ ہم کھڑے ہوگئے۔کسری فرض پڑھ کر میں نے پُشت دیوار سے ٹکا کر اُسے دیکھا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔دُعا کیلئے اُٹھے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اُس کا سارا وجود اُوپر والے کے قدموں میں کسی طلب کیلئے گویا مجسم تھا۔چہرہ جیسے حُزن ویاس کی بارش میں بھیگ رہا تھا۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔میرا دل تڑپ سا گیا۔اِس دید میں اپنایت اور محبت تھی۔میں نے اُسے بانہوں کے کلاوے میں بھر کر اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چاہا کہ وہ میرے سامنے کھُل جائے۔

پَرس کھول کر اُس نے ایک پوسٹ کارڈ نکالا۔میرے سامنے کیا۔میں نے دیکھا تھا۔سفید اور سبز رنگوں میں چند لکیریں جن کی بظاہر صورت کسی راکٹ جیسی جو زمین کے سینے کو چھید نے جارہی ہو۔

"غور سے دیکھیے"جیسی بات پر اوپر لکھا ہوا پڑھا تو معلوم ہوا فلسطین کا نقشہ

ہے۔1946ء سے جب برطانیہ اور اس کے حواریوں نے اِس پورے علاقے کی بندر بانٹ کی۔ بائیس ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ ان ٹکڑوں کو نئے مُلکوں کے نام دیئے۔ اور باقی بچنے والے اِس ٹوٹے کو اپنے پاس رکھا اور

A land without a people for a people without a land

کا راگ الاپنے والوں کو یہ تحفہ دیا۔

1946ء میں فلسطینیوں کی اِس سرزمین میں بنی اسرائیل کی یہ نا ہنجار او لامحدود تھی۔ مغربی اور مشرقی کناروں کے تھوڑے سے حصّے پر چاولوں کے دانوں کیطرح بکھری ہوئی۔ آخری نقشہ 2005ء کا تھا۔ ایک ہزار سال سے اِس زمین کے باسی اُن کی جگہ لے بیٹھے تھے۔

فلسطین ایک المیہ۔ ایک گہرا دکھ۔ عربوں کے سینوں میں پلتا ہوا ایک ناسور۔

کارڈ میرے ہاتھوں میں تھا۔ یونہی اس کی پشت کو دیکھ بیٹھی۔ بڑی موہ لینے والی لکھائی تھی۔ انگریزی میں لکھے گئے یہ اشعار کیسے دل چیر گئے تھے۔

If only our enemies would read our letters twice or three times,

apologize to the butterfly for their game of fire

اُس نے سرک کر میری طرح اپنی پُشت دیوار سے لگائی۔ ایک لمبی سانس نکالی اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرے دادا کا گھر حیفہ میں تھا۔ حجاز ریلوے اسٹیشن کے پاس۔ حیفہ بحیرہ روم کے شمالی کنارے پر صدیوں پرانا تاریخی شہر ہے۔ یہاں سے ٹرین ہمارے مقدس شہروں مکہ اور مدینہ کو براستہ دمشق جاتی تھی۔ زائرین کیلئے عثمانیوں کا بنایا ہوا ریلوے اسٹیشن۔ اب تو ظالموں نے اُس کا نام ہی بدل دیا ہے۔ حیفہ مشرقی اسٹیشن رکھ کر میوزیم بنا دیا ہے۔

میرے بچپن اور جوانی کی یادیں سلفیٹ Salfit شہر کی قصباتی جگہ حارث کے گلی

کوچوں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے والد ڈاکٹر ابوموسیٰ بز از بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ جن کا بچپن اور جوانی حیفہ میں گزری تھی۔ یہ وہ دن تھے جب غریب فلسطینیوں سے بنجر زمین خریدی جاتی یا ان کے شکستہ حال گھروں کا مہنگے داموں سودا کیا جاتا۔غریب لوگ پیسے زیادہ ملنے پر خوش ہوتے۔اس کے پیچھے جو مقاصد کام کررہے تھے اُس کا تو انہیں شعور اور ادراک ہی نہیں تھا۔کہیں کہیں زور زبردستی ہوتی۔یوں بڑی بڑی خوبصورت کالونیاں بنتی جاتیں اور باہر سے یہودیوں کو لاکر بسایا جاتا۔باہر کی دُنیا اِس صیہونی پروپیگنڈے کے شوروغل سے متاثر تھی کہ فلسطین کی سرزمین ایک بے آب وگیا صحرا ہے جو وہاں جتنی زمین چاہے خریدے۔رہے عرب نرے کھوتے کے کھر۔جاہل،اُجڈ اور بے شعوری قوم۔

میرے والد کی کلاس فیلو یائل یہودی ہونے کے باوجود ان باتوں پر بہت جلتی کڑھتی تھی۔یائل جرمن نژاد تھی۔وہ اپنے والدین کے ساتھ حیفہ کی جرمن کالونی میں رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے شہر بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شہروں کو غریب فلسطینیوں سے پاک کرنے کا عمل زور پکڑ گیا۔مہاجروں کے کیمپوں میں روز افزوں اضافہ،اُن کی زمینوں پر شاندار پلازے،کوٹھیاں اور صنعتی یونٹ تعمیر ہوتے گئے۔فلسطینیوں کی جھونپڑیوں میں خوفناک پھیلاؤ آ گیا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب میرے والد کو حیفہ چھوڑ کر حارث آنا پڑا۔پر کہیں ایک دُکھ کی لہر ان کے اندر سے اُٹھتی تھی۔انہیں اپنا باغ یاد آتا۔اُس میں اُگے سنگتروں کے پیڑ یاد آتے۔بحیرہ روم کا ساحل،اپنا گھر،اس کی گلیاں بہت وقت وہ مضطرب رہے۔

میری دادی کیلئے حیفہ چھوڑنا گویا موت کو گلے لگانے جیسا تجربہ تھا۔

کبھی ہجرت کا زہر بھرا گھونٹ بھرا ہے؟ اُس نے سسکاری بھری۔

میں نے دہل کر اُسے دیکھا۔ میں خود تو اس تجربے سے نہیں گزری تھی کہ تقسیم ہند پر بہت کم سن تھی۔ مگر آنے والے بہت سالوں اِس عملی مشاہدے سے گزری کہ میری دادی ہمہ وقت تیار ہی بیٹھی رہتی تھی کہ بس دیس واپس جانا ہے۔ کمروں کو اُس نے تالے کب لگائے تھے۔ وہ تو بہ امر مجبوری لوگوں کے اصرار پر باہر نکلی تھی۔

"پھوٹ لوگ تو باؤلے ہو گئے ہیں۔ کوئی اپنا گھر بھی یوں چھوڑتا ہے۔ چلو دو چار دن بعد آ جائیں گے۔"

میری ماں چولہے کے پاس بیٹھی راکھ پھرولتے ہوئے مدتوں دیس اوراس کی گلیوں کو یاد کرتی اور دیس کے ناسٹلجیا سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

سابق مشرقی پاکستان میں شمالی ہند سے ہجرت کر کے آنے والی میری بہت سی دوستوں کے والدین اور خود وہ 1971 کے المناک حادثے کے بعد جس ٹوٹ پھوٹ کا ذہنی شکار ہوئیں اُن کی تو میں خود چشم دید گواہ تھی۔

تو مجھے اُس کی دادی کے جذبات سمجھ آتے تھے۔ اُس کے گھر کا آنگن بہت کشادہ تھا۔ دمشق، حلب اور فلسطین کے معززین کے گھروں جیسا جن کی دیواروں پر چڑھی انگور کی بیلوں پر منوں پھل لگتا تھا۔ سنگترے کے بوٹے جب منوں وزنی بوجھ سے جھک جھک پڑتے تو اُس کی آنکھیں انہیں دیکھ دیکھ کر ہیروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتیں۔ صحن کے عین درمیان کنواں تھا۔ بڑے بھاری شہتیروں والے کمرے تھے جن شہتیروں پر اُس نے میرے دادا سے ضد کر کے گل کاری کروائی تھی اور جو بہت خوبصورت لگتے تھے۔ وہ باؤلی سی آنکھوں میں آنسوؤں کے کٹورے بھرے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتی تھی۔ لمبی لمبی محرابی جھروکوں والی بالکونیاں دیکھتی تھی۔

"دیکھوتو اِس کمرے میں میرا چچا مفتئ فلسطین امین الحسینی ٹھہرتا ہے۔یہ کمرہ تو اُس کے لئیے مخصوص ہے۔"

اُسے اپنی زمین پر زیتون کے باغوں کی فکر تھی۔وہ بھیڑبکریوں کیلئے ہلکان ہوہو جاتی تھی۔

وہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی پر اپنے چچا کے گھر آنے پر معززین حیفہ کے ساتھ بیٹھک میں ان کی جو نشستیں جمتیں اور وہ شوق و محبت سے کھانے اور قہوے کی سروس خود بھاگ بھاگ کر کرتی تو ایسے میں اُن کی باتیں سُنتے سُنتے وہ بہت بالغ ہوگئی تھی۔

تُرکوں کے فضیحتے کرتی۔مسلمان تھے پر کیسے مسلمان؟ ہمیں اپنی محکوم رعایا بنا کر رکھا اور ہمیشہ نظر انداز کیا۔آخری عثمانی سلطان کے لتّے لیتی کہ جس نے اُس مردُود بارن ایڈمنڈ رتھس چائیلڈ کو فلسطین میں ایک یہودی آبادی کی آبادکاری کی اجازت دی تھی۔سارا معاملہ تو یہیں گڑبڑ ہوگیا تھا۔تم مجھے سَر اندر کرنے دو۔بیٹھنے اور لیٹنے کی جگہ میں خود بنالوں گا۔وہ اُونٹ اور خیمے کی کہانی سُنانا شروع ہوجاتی۔

تب دھیرے سے میرے والد انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ہجرت کا عمل صدیوں قرنوں سے ہے۔ایک مسلک ایک عقیدے کے لوگ پَرائی جگہوں پر اپنی آبادیاں بھی بنا لیتے ہیں۔ہاں البتہ یہ غلط ہے کہ آپ اِس حد تک چلے جائیں کہ مالکوں کو نکال باہر پھینکیں۔پھر ان کی زمینیں چھین لیں اور انہیں اپنی ہی سرزمین پر قیدی بنادیں۔

تب لعن طعن کے گولے برطانیہ اور اس کے حواریوں پر برسنے لگتے۔شریف مکہ پر طوفانی یلغار ہوتی۔

ارے وہ پاسبان حرم تھا کہ ڈاکو۔ہماری قیمت وصول کی۔ہمیں سکّوں کے عوض

بیچ ڈالا۔

میرے والد چُپ چاپ اُن کی باتیں سُنتے رہتے۔ وہ اُن کے جذبات سمجھتے تھے پر اُنہیں مزید دُکھ سے بچانے کیلئے ہونٹوں کو سیئے رکھتے۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کے دل کی ہر دھڑکن نظار قبانی کے شعروں کے ساتھ دھڑکتی اور ان کے خون کی گردش تیز اور تیز تر ہوتی جاتی۔

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

اگر یہ مجھے روس، رومانیہ، پولینڈ اور ہنگری لے آئے مہاجروں سے بچا سکے

یہ مہاجر فلسطین میں آبسے

انہوں نے القدس کے مینار اقصیٰ کے دروازے اور محرابیں چُرالیں

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

جب تک نیوورلڈ آرڈر میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا

اُن کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا

میں دہشتگردی کا حامی ہوں

تب ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ دائیں ہاتھ کی پوروں سے انہیں صاف کرتے ہوئے وہ وہاں سے اُٹھ جاتے۔

اور گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ حیفہ کی زمین پر بس فلسطینیوں کا خال خال کوئی گھر رہ گیا اور یہی وہ دن تھے جب میرا باپ حیفہ چھوڑنے کو کہتا تھا اور میری دادی کو ہول اُٹھتے تھے۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ ھئیت اور رچنی میں آپ کے کتنے رشتے دار اور دوسرے لوگ تھے۔ کیا ہوا؟ سارا علاقہ مسمار کر دیا گیا۔ عالیشان گھر بنے اور یورپ کے مُلکوں سے

اسرائیلی آئے اور قابض ہوگئے ۔مہربانی کریں ابھی گھر کے دام مل رہے ہیں ۔یہ نہ ہو کہ اِس سے بھی جائیں ۔"

وہ چھم چھم روتی تھی ۔اُس کا کلیجہ منہ کو آتا تھا اور روندھے گلے سے کہتی تھی ۔کہاں جانا ہے؟ اچھا تو چلو نظارت میں جابستے ہیں ۔

اُن کی ایک بیٹی نظارت کے پرانے شہر میں العبید مسجد کے پاس مارکیٹ والے علاقے میں رہتی تھی ۔

میرے والد چُپ تھے ۔فیصلہ کرنے میں بہت سوچ و بچار کے بعد قدم اٹھانے والے ۔حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ سمجھتے تھے کہ گرجاؤں مناریوں اور شیشی گاگوں سے سجا یہ قدیم شہر آنے والے وقتوں میں اسرائیل کی ظالمانہ گرفت میں ہوگا ۔

تو پھر عکا چلتے ہیں ۔میری دادی نے آہ بھری تھی ۔

عکا کیلئے میرے والد رضامند تھے ۔پانچ ہزار سال کے تہذیبی ورثے کا مالک بہت خوبصورت عکا ۔مغرب اور مشرق کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی شہر میں دیکھنے کو ملے جیسا یہاں تھا ۔آرٹ اور مذہب کے امتزاج سے گندھا ہوا ۔دُنیا کی بہت ساری تہذیبوں اور ثقافتوں کی باقیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے قلعوں، گرجاؤں، مسجدوں، مندروں سے بھرا ہوا شہر جو اپنے قدیم جنگجوؤں، اپنے معماروں اور اپنی گزشتہ شان و شوکت کی کہانیاں سُناتا ہے ۔

مگر پتہ نہیں کیوں انہوں نے سالفیت Sulfit کو ترجیح دی ۔

وہ ڈاکٹر تھے ۔ہمدرد اور غم گسار سے ۔نہ یہ دیکھتے کہ ان کا مریض عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان ۔

نئی جگہ بسنے کا وادہ ویلا تو اپنی جگہ تھا ۔پر وہ حادثہ تو جیسے اُن کی جان پر گزر گیا ۔جون

کے تپتے دنوں کا حادثہ۔جائے نماز پر ہی بیٹھے بیٹھے آنسوؤں کی مالا پروتی جاتیں۔کبھی شدید غصے سے لرزتی آواز اور کبھی غم میں ڈوبے لہجے میں میرے والد کو آواز دیتے ہوئے کہتی چلی جاتیں۔

"سُنتے ہو ابو موسیٰ اِن مصریوں کو چوڑیاں کیوں نہیں دے آتے۔ارے ایسے بزدل۔انہوں نے بٹہ لگا دیا عربوں کی روایات کو۔بھاگنے میں گھوڑوں کو بھی مات دے دی۔نہر سویز تک سارا سینائی دے دیا۔کس آرام سے اُن کی جھولی میں ڈال دیا۔شام اور اِس اُردن کو بھی ڈوب مرنا چاہیے۔آج گولان کی پہاڑیاں چھینی ہیں کل دمشق پر ہاتھ ڈالیں گے۔یروشلم تو گیا۔مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات کے رکھوالے بھی وہ ہوئے۔

ارے ابھی پتہ نہیں کیا کیا دیکھنا ہے؟"

پھر آہ وزاری بڑھ جاتی۔جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے کہیں آنسوؤں کے دھاروں میں بہتی آوازیں دیتیں۔

"ابو موسیٰ کہاں ہو؟ ارے جاؤ نکلو۔دیکھو تو جنہیں دیس نکالا دیا ہے وہ کس حال میں ہیں؟ جیتے ہیں یا مر گئے ہیں۔اِن ظالموں نے بڑی گولہ باری کی ہوگی۔توپ بندوقوں نے ان کے کلیجے چھلنی کر دیئے ہوں گے۔ارے ڈاکٹر ہو تم۔جاؤ ان کے زخموں پر مرہم رکھو۔

ارے ابو موسیٰ اب اللہ کی مصلحتوں کو میں کیا نام دوں۔تجھے اِن دو لڑکیوں کی جگہ دو بیٹے دے دیتا تو کیا تھا میں ان کے ہاتھوں میں بندوقیں نہ سہی پتھر پکڑا دیتی۔ارے ایک دو کے ہی سر پھوڑ دیتے۔"

ہماری والدہ اُس وقت ان کے قریب ہی کہیں موجود ہوتیں۔میری بڑی دونوں بہنیں چھوٹی چھوٹی سی ان کے جائے نماز پر آگے پیچھے دادی کی باتوں کی کاٹ سے بے نیاز

چکر کاٹتی رہتیں۔

ایسے دُکھ بھرے، بہت سے لمحوں میں اُنہیں قطعی یاد نہ رہتا کہ اُن کا بڑا اسعادت مند بیٹا انہیں بتا کر ہی اُردن کے کیمپوں میں گیا ہے۔

تاریخ کا کتنا بڑا جبر۔ہزاروں فلسطینی بے گھر ہو گئے۔اُن کی بڑی تعداد شام اور اُردن کے مہاجر کیمپوں میں ڈیرے ڈالی بیٹھی تھی۔

اب فلسطین کا ہر گھر ماتم کدہ ہے۔ہوا کرے۔عرب اور مغربی دُنیا کو اس سے کیا۔

اور ایسے ہی دنوں میں میرے بڑے ماموں ہمارے گھر آئے اور ہماری دادی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے نظار قبانی کی وہ نظم انہیں سُنائی تھی جو شاعر کے ہونٹوں سے نکلتے ہی تند و تیز ہواؤں کے جھکڑوں کی طرح عرب دنیا میں پھیل گئی تھی۔میری بہنیں مجھے بتایا کرتی تھیں کہ وہ نظم دادی کے ساتھ ساتھ انہیں بھی زبانی یاد ہو گئی تھی۔

کوئی ایک بار تھوڑی میری دادی بار بار ان اشعار کا وِرد مقدس آیات کی طرح کرتیں۔

جان کی امان پا سکتا تو سلطان سے کہتا۔

سلطان آپ دو جنگیں ہار چکے ہیں۔آپ نسل نو سے کٹ چکے ہیں۔دشمن ہمارے خون سے ہولی کھیل گیا۔

عرب بچو۔مستقبل کو بتا دو تم ہماری زنجیریں توڑ دو گے۔عرب بچو۔ساون کے قطرو۔تم ہی وہ نسل ہو جو شکست پر غالب آئے گی۔

غزہ کے بچو اپنی جنگ جاری رکھو۔

ہم مُردہ اور بے گور ہیں۔

اِن اطفالِ سنگ نے ہماری عباؤں پر سیاہی انڈیل دی ہے۔

او غزہ کے دیوانو۔

وہ جب یہ اشعار پڑھتیں تو میری بہنوں کی طرف دیکھتیں۔

" کاش یہ لڑکے ہوتے۔"

میرے والد مہینوں بعد آئے کمزور، نڈھال، شکستہ، ٹوٹے پھوٹے سے۔ کیمپوں کی حالت زار۔ ہسپتالوں میں نیپام بموں سے جھلسے ہوئے بے کس و لاچار فلسطینی۔ متاثرین تک پہنچنے کی راہوں میں حائل رکاوٹیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کا اغوا اور اُن کا اور عام لوگوں کا قتل عام۔

فلسطینیوں کو اپنی یہ لڑائی خود لڑنی ہے۔ کوئی عرب مُلک اُن کی امید نہیں۔ کوئی اُن کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔ سب اپنے اپنے مفادات کیلئے بِکے ہوئے ہیں۔

بستر مرگ پر بھی میری دادی فلسطین کیلئے معجزوں کی منتظر رہی۔ کسی صلاح الدین ایوبی کے اُٹھ کھڑے ہونے کی دعائیں کرتی کرتی قبر میں اُتر گئی۔

بیٹا تو میرے باپ کے شاید مقدر میں نہ تھا۔ تیسری لڑکی میری صورت میں گھر اور آ گئی۔ گھر تین لڑکیوں سے بھر گیا۔ جب ہوش سنبھالا میری بڑی بہنیں قاہرہ پڑھنے جا چکی تھیں۔ بیروت تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

اپنی بہنوں کے ساتھ میں دیر بعد شامل ہوئی تھی۔

وقت کے ساتھ ہتھکنڈے، کن ذلیلانہ حربوں پر اُتر رہے تھے۔ ہمیں اس کا احساس ہر پھیرے پر ہوتا تھا۔ ہم تینوں بہنیں جب بھی گھر آتیں۔ جگہ جگہ ہماری گاڑی روکی جاتی۔ جا بجا چیک پوسٹوں پر ہمارے کاغذات چیک ہوتے۔ میری بڑی بہنیں جزبز ہوتیں۔ اُن کی چتونوں پر پڑے بَل آج سمجھ آتے ہیں فوجیوں کی نگاہوں کا گرسنہ انداز کا

مفہوم تب نہیں آج میرا خون کھولاتا ہے۔

مار دھاڑ، بے دخلی اور ہماری زندگی اجیرن کرنے کا ہر حربہ اپنایا جا رہا تھا۔کنکریٹ کی دیواریں، برقی باڑھیں، آبزرویشن ٹاور، خندقیں، سُرنگیں اور پرمٹ سسٹم کیا کیا نہیں ہمارے لیے کیا گیا۔

وہ باغ وہ زمینیں جو کبھی فلسطینیوں کی تھیں اب اُن پر وہ قابض تھے۔بیچارے فلسطینی پھل اُن سے خریدتے اور سڑکوں کے کناروں پر کھڑے ہو کر انہیں بیچتے۔اُن کی Settlements پر دہاڑی دار مزدور بن کر کام کرتے۔مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے پر جانے کیلئے سویرے سویرے لائنوں میں کھڑے ہو جاتے۔پرمٹ سسٹم جیسے تکلیف دہ مرحلوں سے گزرتے۔

وہ دن بھی میں اپنی یادداشتوں سے کبھی نہیں نکال سکتی۔میں اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تھا۔وہ کُرسی پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔غزہ کے جنوب مشرقی علاقے "زیتون" میں رہنے والی اُن کی بےحد پیاری پھوپھی کی بیٹی اسرائیلی بمباری سے شہید ہوگئی تھی۔اسرائیلی طیاروں نے بمباری کی تھی۔میزائل ان کے گھر گرا تھا۔ان کے دو کمسن پوتے اور وہ خود شہید ہوگئی تھیں۔

تعزیت کیلئے بھی بہت دنوں بعد جا سکے کہ محاصرہ طول پکڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر ابوموسیٰ بزاز دو بیٹیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکا تھا۔سب سے بڑی ڈاکٹر لائیلا انگلینڈ تھی، نمبر 2 یسرا میری پھوپھی کے گھر نظارت میں، تیسری میں یعنی آرینا اب اِس مرحلے سے گزر رہی تھی۔میری زندگی میں ڈاکٹر ایثار البشر کا آنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ڈاکٹر ایثار البشر فلسطینی تھا۔مگر پرائمری کے بعد آئر لینڈ اپنے چچا کے پاس چلا گیا تھا۔وہیں اُس نے میڈیکل کیا۔

گو وہ باہر رہا مگر فلسطین اُس کے وجود کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا تھا۔وہ جب بھی آتا حالات کے تیور دیکھ کر کُڑھتا، پیچ و تاب کھاتا اور اپنا خون جلاتا اور پھر دُور نزدیک جگہ جگہ پھرتا۔لوگوں کو دیکھتا، انہیں چیک کرتا، دوائیاں دیتا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے اِس اُجڑے پُجڑے محکوم و مجبور وطن آ گیا۔مسیحائی کا تحفہ اُسے قدرت نے انعام کی صورت دیا تھا۔عجیب سی بات تھی وہ قرونِ وسطیٰ کے طبیبوں کی طرح مریض کو لٹا کر اُس کا سَر سے پاؤں تک معائنہ کرتا۔اور یہ کیسی حیران کُن نا قابلِ یقین بات تھی کہ جونہی اس کے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں بیمار کے اعضاء چیک کرتے کرتے اس کے پاؤں کی انگلیوں تک پہنچتیں، مرض ہاتھ جوڑے اُس کے سامنے مجسم ہو جاتا۔نہ کوئی ایکس رے نہ کوئی رپورٹ نہ کوئی ٹیسٹ۔

اُس کی اِس عجیب و غریب سی خوبی نے اُسے قرب و جوار میں خاصا مشہور کر دیا تھا۔

ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔

میں سو کر اُٹھی۔میرے سر اور گردن میں ایسا شدید درد تھا کہ چیخیں نکلتی تھیں۔نہ صرف میرے والد بلکہ چند دوسرے ڈاکٹروں نے بھی چیک کیا۔ابھی ٹیسٹوں کا مرحلہ جاری تھا جب اتفاق سے یشار البشر حارث میرے والد سے ملنے آ گئے۔انہوں نے صرف پانچ سے چھ منٹ کے معائنے میں بتا دیا کہ اِسے مینجائٹس ہو گیا ہے۔فوری تشخیص اور علاج نے مجھے نئی زندگی دی تھی اور میں ڈاکٹر کی عاشق ہو گئی تھی۔

میری اِس وابستگی کا اظہار میرے والد کی زبان سے ہوا اور یشار کی عنایت کہ اُس نے اِسے پذیرائی دی۔

گھر کی آخری اور بے حد لاڈلی بیٹی کی شادی جس انداز میں ہوئی وہ داستان بھی

دل ہلانے والی تھی۔

اندرون وطن عزیزوں کے علاوہ بیرون مُلک سے بھی رشتے کے چاچے، ماموں بھائیوں اوران کے بال بچوں کا کٹھ ہوا پڑا تھا۔اِس رنگ رنگیلی فضا کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔جب مغربی کنارے کی شمالی پہاڑیوں کے دامن میں اسرائیلیوں کی آتمار Itamar نامی Settlement میں فوگل Fogel فیملی کے پانچ افراد کوان کی خوابگاہوں میں چاقوؤں سے قتل ہوجانے کی خبر آئی۔

اسرائیلی ملٹری اور سیکورٹی سروسز نے بغیر تحقیق کے ملحقہ فسطینی گاؤں آوارتا Awarta پر چڑھائی کردی۔نوجوان لڑکوں کی گرفتاریاں، گھروں کی تلاشی، سامان کی توڑ پھوڑ چند گھنٹوں میں حشر نشر ہو گیا۔

یشار کا بڑا بھائی اوراُس کے تین بیٹے بھی اسی چکر میں دھر لیئے گئے۔وہ شادی میں شرکت کیلئے تیاریوں میں تھے جب یہ قیامت ٹوٹی۔نابلوس میں کرفیو لگ گیا تھا۔بارات کیسے آتی۔آنسو میرے گالوں پر بہتے تھے۔

اور میں اپنی بہنوں سے کہتی تھی۔میری شادی پر ہی یہ سب ہونا تھا۔

ابا کے اسرائیلی دوستوں سے رابطے، بھاگ دوڑ، فلسطینی مئیر اور سب سے بڑھ کر انکل یوری ایوزی سابق ممبر اسرائیلی پارلیمنٹ کی کاوشیں رنگ لائیں۔انکل یوری ایوزی اسرائیل میں رہتے ہوئے، سیاست دان ہوتے ہوئے، حق سچ کا علم اٹھائے رکھتے ہیں۔ظلم وجبر پر بولتے اور لکھتے رہتے ہیں اور فلسطینیوں کے حقوق اوراُن کی آزاد ریاست کے قیام کی حمایت میں ہمیشہ آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

لڑکے بارات میں پھر بھی شامل نہ ہو سکے کہ وہ تو زیرِ حراست تھے۔بیچاروں کے کہیں فنگر پرنٹ، کہیں ڈی این اے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔

یہ شادی نہیں تھی فرض کی ادائیگی تھی ۔میں نے میک اپ نہیں کیا۔کپڑے نہیں پہنے۔بس اُسی حالت میں گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

مہینوں میں اِس دُکھ سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔یشار مجھے سمجھاتا اور دلداری کرتا نہ تھکتا تھا اور میں کہتی تھی۔

" کمزور ہونا کتنا بڑا جُرم ہے۔"

یشار نابلوس کے رفیدیہ اسپتال سے منسلک تھا۔ایک دن کوئی دو بجے گھر آیا۔میرے ہاں دوسرا بچہ متوقع تھا۔کھانا تیار نہیں تھا۔

کچھ کھانے کو۔اس کے انداز میں ہمیشہ دھیما پن ہوتا۔

میں نے ذرا سے تامل ذرا سے تاسف سے اپنی خرابیٔ طبیعت کا بتایا۔

چلو چھوڑو۔زاطر تو ہے نا۔اُسے ہی لے آؤ۔

میں نے میز پر خبص، زیتون اور زاطر سجا دیا۔

زاطر ہمارے مڈل ایسٹ میں بہت کھایا جاتا ہے۔ہربل اور تلوں کا آمیزہ جسے زیتون سے ملا کر روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

ابھی اُس نے نوالے کو زیتون میں ڈبو کر اُسے زاطر میں لتھیڑنے کیلئے نکالا ہی تھا کہ باہر کسی جیپ کے رُکنے اور پھر بیل بجنے کی آواز آئی۔

میں دوسرے کمرے میں چلی آئی۔

خادمہ نے مجھے بتایا کہ اسرائیلی فوجی ہیں۔

میرا دل دھک سے ہوا۔اُسی سے پتہ چلا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

اندر کیا ہو رہا تھا؟میرا دل سینے میں پھڑ پھڑاتا تھا۔

دیر بعد دروازہ کھلا۔آنے والے جیپ میں بیٹھے اور چلے گئے۔یثار اندر آیا۔مجھے فق بیٹھے دیکھا۔سینے سے لگایا اور بولا۔

"حد ہوگئی ہے۔نارمل ہو جاؤ۔لگتا ہے تمہارا دل جیسے ابھی اندر توڑ کر باہر آجائے گا۔اور جب میں نے کچھ جاننے کی کوشش کی اُس نے رسان سے کہا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔"

میرا اصرار حد سے بڑھا۔اُس نے کہا۔"مریض اگر اپنی بیماری کو راز میں رکھنے کا متمنی ہےتو ڈاکٹر کو اختیار نہیں کہ وہ اس کا پردہ فاش کرے۔"

پر میری حد سے بڑھی ضد پر بالا آخر اُسے بتانا پڑا۔

آنے والوں میں سے ایک اسرائیلی فضائیہ کا پائلٹ مسٹر پیری یاتم تھا۔دوسرا اُس کا دوست۔اُس پائلٹ کے ساتھ ایک گھمبیر مسئلہ ہوگیا۔جونہی وہ کسی مشن پر جانے کیلئے جہاز اُڑا کر فضا میں لاتا اُس کے سَر میں شدید درد شروع ہو جاتا۔وہ اپنی بیماری ملٹری اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔میڈیکل گراؤنڈ پر فوراً ایکشن ہو کر سارا کیرئیر داؤ پر لگ جاتا تھا۔یثار کے بارے میں سُنا تھا۔علاج کیلئے آیا تھا۔

اس کی پریشان کُن بیماری نے صحت یاب ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں لیا تھا۔یثار کا معتقد ہوگیا۔اسرائیلی افسروں میں اُس کی مسیحائی کا اچھا خاصا پرچار ہوا۔

یثار بے باک تھا۔سچی بات کہنے سے اس کے منہ کو کوئی مصلحت روک نہیں سکتی تھی۔ایک بار نہیں کئی بار وہ اسرائیلیوں اور لیبر پارٹی کے ارکان سے اُلجھا تھا کہ وہ پرشیائی بن گئے ہیں۔کل جو اُن کے ساتھ ہوا تھا وہی وہ فلسطینیوں کو لوٹا رہے ہیں۔اس کا انجام جانتے ہو بہت خوفناک ہوگا۔مت بھولو یہ سب جو بظاہر نظر آتا ہے اور جو تمہارے غلبے اور اقتدار کا شو آف ہے ایک دن تمہیں پاتال میں پھینک دے گا۔

ابھی بھی وقت ہے۔کیا یہاں ایسی دو فلسطینی ریاستیں نہیں بن سکتی ہیں جو امن اور آتشی سے رہ سکیں۔

کچھ لوگ اگر اُس کی ایسی باتوں پر خار کھاتے تھےتو وہیں چند ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔

مگر یہ ٹھیک سمجھنے والےتو آٹے میں نمک برابر تھےاور جو اُس سے نفرت کرتے تھے بالآخر وہ اُسے زمین کا رزق بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ تو ذرا بھی مشکل کام نہیں تھا۔کسی معقول بہانے کی بھی ضرورت نہیں تھی ۔دوسرے بچے کی پیدائش پر میں کمرے میں تھی۔یشار چھت پر تھا۔

موسم میں کچھ تلخی تھی ۔پتہ نہیں میرا دل کیوں گھبرایا۔میں نے ٹی وی کھولا۔دو تین چینل بدلے۔فلسطین کی بہت سُریلی گلوکارہ خاتم السحر محمود درویش کی امر ہو جانے والی نظم گا رہی تھی۔

جیل بہت خوبصورت ہیں باہر کی دنیا کے باغوں سے۔
ہم سے ہمارا وطن ہےاور وطن سے ہم ہیں۔
ہماری جنم بھومی، ہمارے اجداد کی، ہمارے بچوں کی، ہماری جنت۔
آؤ کہ ہم اپنے دشمنوں کو کبوتر کی غٹرغوں سنائیں۔
اگر وہ سُننا چاہیں۔
آؤ کہ انہیں سپاہیوں کے ہیلمٹوں پر پھول اُگانا سکھائیں۔
اگر وہ سیکھنا چاہیں۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔روتے روتے جانے کب سو گئی۔بس شوروغوغا سے آنکھ کھل گئی تھی ۔ساتھ کی چھت پر سوتا سارا خاندان ان کی وحشت کی بھینٹ

چڑھ گیا تھا۔ یشار خون میں نہایا ہوا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں کا کہنا تھا کہ چند شر پسندوں نے اُن پر گولیاں چلائی تھیں۔ ان کے تعاقب اور فائرنگ پر جوابی کاروائی میں یہ سب ہو گیا۔ اور جب وہ پائلٹ تعزیت کیلئے آیا میں نے کہا تھا۔

"مجھے بتاؤ میرے بچے بڑے ہو کر تم لوگوں سے انتقام نہیں لیں گے۔ ان کی پور پور میں جس نفرت کے بیج آج تم لوگ بو رہے ہو یہ کل فصل کی صورت میں پروان چڑھیں گے۔

یاتم نے شرمندگی سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ میری طرف دیکھا اور بولا۔

شاید آپ نہیں جانتیں۔ میں اسرائیلی ہوتے ہوئے بھی دوسرے درجے کا شہری ہوں کیونکہ میرا تعلق Sephardic Jews سے ہے جو اگرچہ عبرانی جانتے ہیں مگر ہسپانوی النسل ہیں جو کیتھولک عیسائیوں کے سپین پر قبضے کے بعد اُن کے ظلم و ستم اور اپنا مذہب نہ تبدیل کرنے کے جُرم میں ہجرتوں کے مسافر بنا دیئے گئے۔ جائے پناہ ملی تو کہاں؟ مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں عراق تک اور بلغاریہ سے لے کر جنوب میں سوڈان تک۔ مسلم دینا ہمارا ٹھکانہ بنی۔

اُس کے اندر سے دُکھ اور یاس میں لپٹی بڑی لمبی آہ نکلی تھی۔ ان کا تکبر، ان کا غرور اور ان کا ظلم انہیں ایک دن لے ڈوبے گا۔

اُس نے سر جھکا لیا تھا۔

نظارت میں رہنے والی اپنی بہن کی جھولی میں اپنے دونوں بیٹے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا۔ "اپنے بیٹوں کے ساتھ انہیں بھی پال لینا۔ میں باہر جاتی ہوں تا کہ ان کے لیے بندوقوں اور پستولوں کا بندوبست کر سکوں۔"

"دیکھو یاد رکھنا اگر بندوقیں نہ ملیں تو پتھر اور ڈنڈے ضرور پکڑا دینا۔ مزاحمت کی

تاریخ تو ضرور مرتب ہو گی۔"

رہا یہ ٹونی کلف اب ابراہیم یہ تو یونہی پیچھے پڑ گیا تھا۔ محبت کرنے لگ گیا تھا۔ میرے پاس کیا تھا؟ اسلام سے متاثر تھا۔ میرے پیار میں اُلجھا تو سر تا پا اِس چلن میں ڈوب گیا۔ شادی کے لیے جب اصرار بڑھا میں نے شرط رکھ دی کہ اگر تم سے میرے لڑکے ہوئے تو میں انہیں فلسطین بھیج دوں گی۔ اُسے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔

دو بیٹے ہیں۔ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

وہ رُک گئی تھی۔ چند لمحوں تک خلا میں دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں جذبات کا طوفان اُمنڈا ہوا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر قبل میں صلاح الدین ایوبی کے مزار پر تھی۔"

دنیا کے تہذیبی تصادم کے بھی کتنے جبر ہیں جو تاریخ کے سینے میں درج ہیں۔ ایک اُس ہو چھے فرانسیسی جرنیل ہنری گورو کا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر مال غنیمت کے طور پر فرانس کو ملنے والے مُلک شام کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے دمشق میں داخلے پر سب سے پہلا کام اُس کا یہاں صلاح الدین کے مزار پر آنے قبر پر کھڑے ہونے اور اپنی آواز کی پوری شدت سے چلّا کر کہنے کا تھا۔

"صلاح الدین سُنتے ہو۔ ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔ دیکھو۔ ہم نے سبز ہلالی پرچم کو سرنگوں کر دیا ہے۔ صلیب ایک بار پھر اپنے عروج پر ہے۔"

آنسو بہاتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

"تم نے یہ سب سُنا اور چُپ رہے۔ صلاح الدین بہت آرام کر لیا ہے تم نے۔ اب اُٹھ جاؤ۔ صدی بیت گئی ہے۔ فلسطین کے بیٹے اور بیٹیاں بہت بے آبرو ہو گئی ہیں۔"

بُتانِ رنگ وخون

پل کے ہزارویں حصے میں بھی لاریف ہادی اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا بیٹا لبریشن ٹائیگرز اف تامل جیسی جنگ جو اور دہشت گرد تنظیم کے اجلاسوں میں شرکت کرتا ہے۔ تنظیم کے بانی ویلو پلائی پر بھاکرن سے عقیدت اس کے مقاصد سے ہمدردی اور تاملوں پر سہنالیوں کی زیادتیوں کے خلاف جافنا کے مضافات میں ہونے والے چھوٹے موٹے جلسے جلوسوں میں کچی پکی تقریریں جھاڑتا ہے۔ حالیہ خودکش حملوں میں مرنے والے چند نوجوانوں سے بھی اُس کا یارانہ تھا۔

اُس کی آنکھوں میں حیرت ہی نہیں تھی وہ شدید کرب سے بھی خوفناک حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا دل وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ اتنا بے خبر تھا۔ کیا وہ اس پر یقین کرے یا نہ کرے؟ اس کا بیس سالہ پانچ فٹ گیارہ انچ لمبی قامت والا بیٹا کب اور کیسے اس جال میں پھنسا۔ اور کیوں پھنسا؟ یہ سارے سوال جواب وہ خود سے کئے چلا جاتا تھا۔

ڈاکٹر حسب اللہ نے آہستگی سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کے اندر کے

اُتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھے۔ سمجھ رہے تھے کہ وہ کس اذیت ناک کیفیات سے گزر رہا ہے؟

یہ سری لنکا کے خوبصورت شمالی ساحلی شہر جافنا Jaffna کی خوبصورت سی صبح تھی۔ پیراڈینیا Paradenliya یونیورسٹی سے ڈاکٹر حسب اللہ کل یہاں آئے تھے۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں رتنا پور گیا ہوا تھا۔ رات کو واپس آیا تو انور سُبحانی نے بتایا کہ صُبح مسجد میں نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کا لیکچر ہے۔ لاریف ہادی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ڈاکٹر حسب اللہ مسلمانوں کی سری لنکن تنظیم کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔ پارے کی طرح متحرک یہ شخصیت سری لنکا کے مسلمانوں کے لئے اُمید اور حوصلے کا پیغام تھی۔

جافنا کی پچاس فیصد مسلمان آبادی کاروباری لحاظ سے خاصی مضبوط تھی۔ ڈاکٹر حسب اللہ کا دو تین ماہ بعد یہاں کا چکر ضرور لگتا تھا۔ مقامی مسلمان اُن کی آمد کے منتظر رہتے۔ سری لنکا کے شمالی علاقوں میں تامل ٹائیگرز کی سرگرمیاں بُہت بڑھ چکی تھیں۔ مسلمان کمیونٹی ان سرگرمیوں سے خاصی پریشان بھی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب!'' لاریف ہادی کی آواز جیسے غم سے بوجھل تھی۔

''کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا یقین نہیں آتا۔'' آواز جیسے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں! حوصلے سے کام لو۔ صورت حال کو بُردباری سے سنبھالو۔ میری معلومات غلط نہیں اور یہاں دیکھو سختی کی ضرورت نہیں۔ جوان خون ہے بِھر جائے گا۔ آرام اور دلداری سے باز پُرس کرو۔''

اس وقت ان دونوں کے ساتھ مسلم رائٹس آرگنائزیشن کے انیس احمد بھی تھے۔

ہادی جب گھر جانے کے لئے کھڑا ہوا تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ریڑھ کی

ہڈی تڑا تو کھا گئی ہو۔ پتا نہیں کیسے وہ مسجد سے باہر نکلا اور گھر آیا۔ بیوی نے اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟''

''ہاں بس ایسے ہی ذرا دل گھبرا رہا ہے۔''

آنگن کے کونے میں پڑے کچے گولڈن ناریل کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ اس نے تیز دھار کے گنڈاسے سے اس کا اوپر والا حصہ کاٹا اور کمرے میں آئی جہاں ہادی لیٹا ہوا تھا۔

بیوی کے ہاتھوں میں پکڑا گولڈن ناریل اور اُس کے چہرے پر چھائے تفکر نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ دھیرے دھیرے گھونٹ گھونٹ ڈاب پیتے ہوئے اُس نے اپنے اندر کی تلخی کو کم کرنا چاہا پر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں آگ لگی ہے پھر دفعتاً اُس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے پاس بٹھا لیا اور بولا۔

''لاطف کہاں ہے؟''

''گھر میں تو نہیں، کہیں باہر گیا ہے۔''

''ابھی نو بجے ہیں اور باہر بھی چلا گیا ہے۔ تمہیں بتا کر نہیں گیا۔''

بیوی کو ہادی کے یوں بات کرنے پر قدرے حیرت سی ہوئی۔ یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں، وہ تو ہمیشہ سے صبح سویرے باہر نکل جاتا تھا۔ کبھی رات گئے گھر آتا۔ ابھی گریجوایشن سائنس فائنل کا تو اسٹوڈنٹ تھا۔

ایک لمحے کے لئے ہادی کا جی چاہا کہ وہ بیوی کو اپنی پریشانی اور تفکر سے آگاہ کر دے۔ اپنا دُکھ اور کرب اس سے شیئر کرے، مگر وہ رُک گیا۔ اُس نے دل میں اپنے آپ سے کہا۔

''اِس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ عورت ذات یونہی خوف زدہ ہو جائے گی۔''

ہادی کا فشنگ کا کاروبار تھا۔جافنا میں اس کی اچھی ساکھ تھی۔اپنی دو لانچیں اور دو فیریاں تھی۔اس کے کارندے مچھلی Kankesantura سے آگے ہندوستان کے ساحلی شہروں تک لے جاتے تھے۔

سائیکل رکشا پر بیٹھ کر وہ اپنے دفتر آ گیا۔جو مورروڈ پر تھا۔جونہی وہ سائیکل رکشا سے اُترا، دفتر کے چھوٹے سے دروازے کے سامنے لاطف کھڑا تھا۔بیٹے کو دیکھتے ہی اس پر غصہ، رنج اور یاسیت کے ملے جلے جذبات کا حملہ سا ہوا، پر خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے بیٹے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔لاطف باپ کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گیا۔بید کی کرُسی پر بیٹھتے ہوئے کر اُس نے کسی قدر حیرت سے باپ کو دیکھا جو پریشان نظر آ رہا تھا۔

ہادی نے گہری نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور مدھم آواز میں کہا۔

''لاطف میں نے زندگی اور کاروباری معاملات میں ہمیشہ سچ بولنے اور سچ برتنے کو ترجیح دی۔جھوٹ، غلط بیانی اور منافقت کبھی میرے کسی معاملے کی بنیاد نہیں رہے۔وہ اصول جو میرے رہے اور ہیں انہی پر میں تمہیں بھی گامزن دیکھنا چاہتا ہوں۔آج میں جو تم سے پوچھوں گا تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے۔''

لاطف حیران تھا، اُس کے باپ نے کبھی لمبی چوڑی باتیں تمہیدی انداز میں نہیں کی تھیں، وہ ہمیشہ سے مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔اُسکا دل دھڑکا اور اُس نے خود سے کہا ''یہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' پھر وہ حوصلے سے بولا۔

'' آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔آپ کو بھی پتا ہے کہ میں صاف اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔''

''تامل ٹائیگرز سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

ہادی نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

لاطف کا رنگ بدلا۔ شاید وہ ذہنی طور پر اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔

''تعلق'' اُس نے زیرِ لب کہا اور پھر کسی قدر جُرات مندانہ انداز میں بولا۔

''میں بس ان کے جلاسوں میں کبھی کبھار شریک ہو جاتا ہوں۔ جس کاز کے لئے وہ جدو جہد کر رہے ہیں میں اُسے درست سمجھتا ہوں۔''

ہادی کا چہرہ بیٹے کی بات پر تپ اُٹھا۔ وہ غصے سے چیخا۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں ان کے کاز سے ہمدردی کرتے ہوئے۔ بے گناہ معصوم لوگوں کو قتل کرتے ہیں، بھرے مجمعوں میں بم پھینکتے اور انسانوں کا قتل و غارت کرتے ہیں۔ انسانی جانیں اُن کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہم نہیں ۔۔۔ پل بھر کے لئے وہ رُکا۔ اُس کی آواز بھرا رہی تھی جب اُس نے بات دوبارہ شروع کی۔

ہمارے جافنا کے میئر ایلفر ڈ دورپایہ کا کیا قصور تھا صرف یہ کہ وہ سنہالیوں تاملوں مسلمانوں اور عیسائیوں سبھوں کا ہمدرد انہیں مل جل کر امن و آشتی سے رہنے کی تلقین کرنے والا ایک مہذب اور شریف النفس انسان تھا جو انہیں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''مگر وہ آزادی چاہتے ہیں۔'' لاطف نے باپ کی بات کاٹ دی۔

بھونچکا سا ہو کر اُس نے بیٹے کی اس بات کو سُنا۔ اُس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ یہ اُس کا بیٹا کیسی لایعنی بات کر رہا تھا۔

''کس سے آزادی؟ سنہالیوں سے جو انتہائی شریف لوگ ہیں۔ عیسائیوں سے جو ملک کا بیس 20% ہیں۔ مسلمانوں سے جو آبادی کا دس فیصد ہیں۔ تامل ہندو لوگوں سے جو وہ خود ہیں۔ شر پسندوں کی یہ قوم انڈیا کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے۔ انڈیا جسے اپنے ہمسائیوں کے معاملات میں دخل اندازی کا بے حد شوق ہے۔ جو چھوٹے ہمسایہ ملکوں کو چین سے رہنے نہیں دیتا، جس کا بڑا مقصد سری لنکا کے شمالی حصے کو اپنے جنوبی حصے سے ملانا ہے۔ آج تم جن

کے ہاتھوں ناچ رہے ہو کل یہ تم مسلمانوں کا سب سے پہلے صفایا کریں گے۔''

''آپ طیش میں مت آئیے۔جذباتی ہونے کی بھی ضرورت نہیں ۔دلیل سے بات کریں ۔احتجاج اور ہتھیار کبھی بھی بغیر وجہ کے نہیں اٹھائے جاتے ۔ان کے پس منظر میں معاشروں کے اندر پلنے والی محرومیاں ،ناانصافیاں ،ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر فوقیت ،غلبہ اور احساس برتری جیسے جذبات واحساسات کا کارفرما ہونا ہوتا ہے ۔زیادتی اور برتری کی پہلی اینٹ 1954ء میں اس دن رکھ دی گئی تھی جب پارلیمنٹ میں سہنالیوں کی اکثریت نے سنہالی زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا۔

تامل لوگ کتنے غریب تھے اور ہیں۔کتنے دھتکارے ہوئے ہیں ۔سری لنکا کی کسی ایک حکومت کا نام لے دیں جس نے انہیں اُنکے حقوق دیئے ہوں۔اقتدار کو سہنالیوں نے اپنی جدی جاگیر بنالیا ہے۔اب وہ کھڑے ہوگئے ہیں۔انہوں نے ہتھیار اٹھالئے ہیں ۔علیحدگی اور خود مختاری کی باتیں کرنے لگے ہیں تو انہیں مصیبت پڑگئی ہے۔اب بھگتیں۔

ہادی کا جی تو چاہا تھا ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے رخسار پر مارے اور کہے ''حرامزادے تاملوں اور اُن کے حقوق کیلئے جذبات کی اتنی اُگل اُچھل کبھی اپنی کیمونٹی کا بھی سوچتے ہو۔''

پر کمال ضبط سے خود سے پر قابو پاتے ہوئے دھیمی اور رسان بھری آواز میں بولا۔

''لاطف تم ابھی ناسمجھ ہو۔اُن کی چالوں اور ریشہ دوانیوں کو نہیں جانتے ۔''

وہ کھڑا ہوگیا اور باہر کی طرف جانے کے لئے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اِک ذرا رُکا اور بولا۔

''اب میں اتنا بھی بچہ اور ناسمجھ نہیں ۔''

کمرہ خالی تھا اور ہادی کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے وجود میں سے کسی نے زندگی کی ساری حرارت کشید کر لی ہے۔ جیسے وہ پتھر کا ہو گیا ہو، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے بظاہر کہیں خلاؤں میں گھورتا ہوا۔ دیر تک وہ اس کیفیت میں رہا پھر اپنے بیٹے کے بے شمار رُوپ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُبھرے۔ اُس کا بڑا بیٹا جس کے وجود سے اُس کی بے شمار توقعات وابستہ تھیں۔ بُہت سارے خواب جن کی تعبیریں اُس کی زندگی کا ماحصل تھیں۔

بازی کیسے اُلٹ گئی؟ بیٹے نے ریل کی پٹڑی کے کانٹے کی طرح راستہ کیسے بدل لیا؟ اُس کی تربیت میں کہاں کمی رہی؟

جے جے ویرا سنگھ اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ویرا سنگھ کو تامل تھا مگر بڑا صلح پسند اور امن و آشتی سے محبت کرنے والا انسان۔ اُس کا بیٹا بھی تحریک کا رکن بن گیا تھا۔ بڑا جوشیلا جوان تھا۔ مرکزی حکومت کے وزیرِ صنعت کا ''مینار'' میں بڑا اہم دورہ تھا۔ بم دھماکے کے لئے اُس کو چنا گیا۔ سازش بروقت ناکام ہوگئی۔ ویرا سنگھ کا بیٹا پکڑا گیا۔ سائنائیڈ کا کیپسول جو اُس کے گلے میں بندھا ہوا تھا اُس نے فی الفور وہ کھا کر زندگی کا رشتہ اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا۔

ایک لمبی آہ اُس کے سینے سے نکلی۔ جذبات سے لبریز یہ بالی عمر جس میں ہوش کے بجائے جوش غالب ہوتا ہے، اُسے جس طرف چاہے موڑ لیا جائے۔

پھر وہ اُٹھا، اپنے بے دم سے وجود کو گھسیٹا اور دفتر سے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں جہاں وہ بالعموم دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر لیٹتا تھا داخل ہوا۔ جونہی وہ چٹائی پر بیٹھا۔ اُس کا ضبط جواب دے گیا۔ اُس کے اندر کا دُکھ آنسوؤں کی صورت باہر آنے لگا۔ وہ روتا رہا۔ اپنے چہرے کو اس پانی میں نہلاتا رہا پھر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کب اُسے اونگھ سی آ گئی۔

جب وہ اس کیفیت سے نکلا ظہر کا وقت تھا۔اُس نے نماز پڑھی۔آج اُس کے سجدوں میں جو تڑپ تھی اُس نے اُس کی آنکھوں کو بار بار بھگویا۔دُعا کے لئے جب ہاتھ اُٹھائے تو اشک بار آنکھیں بند تھیں اور وہ خُدا سے مخاطب تھا۔بُہت دیر تک وہ ہتھیلیاں پھیلائے جامد و ساکت حالت میں بیٹھا رہا۔

پھر جیسے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی منی سی کرن جھلملائی۔مایوسی کی وہ انتہا جس پر وہ اس وقت پہنچا ہوا تھا۔۔۔دل گرفتگی جس میں وہ اُلجھا ہوا تھا قدرے کم ہوئیں۔جیسے کسی گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا میسر آ جائے کچھ ایسی ہی اُس کی کیفیت تھی۔وہ اُٹھا اور گھر آیا۔بیوی نے اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر پُوچھا؟

''کچھ بتاؤ تو سہی، میں صبح سے دیکھ رہی ہوں پریشان نظر آ رہے ہو۔''

بغیر کچھ کہے وہ چٹائی پر بیٹھا پھر بولا۔ ''تم کھانا لاؤ۔''

اُس نے اُبلے چاولوں کی قاب رکھی۔مٹی کی چھوٹی سی ہنڈیا میں پول سمبل (کوکنٹ کی بھجیا) تھی۔دوسری ہنڈیا میں ناریل کے دودھ میں پکائی گئی مچھلی اور سبزی کی کڑھی تھی۔دونوں ڈشیں اُس نے ہادی کے سامنے سجا دیں۔پانی کا جگ اور گلاس رکھا اور خود بھی پاس بیٹھ گئی۔

ہادی چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔جب کھا چکا اور شکر الحمدُللہ کے الفاظ ادا کئے تو بیوی نے ایک بار پھر کہا۔

''کوئی کام کاج کی پریشانی ہے کیا؟ تمہاری کیا بُری عادت ہے کہ تم کچھ کہتے نہیں۔''

ہادی نے خاموش نظروں سے اُسے دیکھا اور چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

''تمہیں اگر کسی بات کی سمجھ نہیں تو بحث مت کیا کرو۔کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔''

بیوی نے برتن سمیٹے اور خاموشی سے اُٹھ گئی۔

ہادی کا چھوٹا بھائی پندرہ سال سے امریکا کی ریاست نیویارک میں مقیم تھا۔ سات آٹھ سالوں سے اُس کے مالی حالات بُہت اچھے ہو گئے تھے۔ پہلے چند سال تو دھکے ہی کھاتا رہا تھا۔ پر اب چند پیٹرول پمپوں اور ایک بڑے سٹور کا مالک ہو گیا تھا۔ ہادی کی اُمید کی کرن اُس کا یہ چھوٹا بھائی ہی تھا جس کے پاس وہ بیٹے کو فی الفور بھیج دینا چاہتا تھا۔

لیٹنے کے بجائے اُس نے اُسی وقت بھائی کو تفصیلی خط لکھ کر اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اپنا سارا درد کاغذ کے صفحوں پر اُتار دینے سے وہ ہلکا ہو گیا تھا۔

خط بند کرنے کے بعد اُس نے لباس تبدیل کیا۔ بیوی سے کہا کہ وہ پوزین جا رہا ہے۔ کل واپسی ہو گی۔

بیوی صبح سے ہی اُس کی متغیر صورت پر پریشان سی ضرور تھی پر وہ کچھ بھید کھول نہیں رہا تھا۔ دوسرے شہروں میں جانا تو یوں بھی اُس کا معمول تھا۔ جافنا کی نسبت پوزین بڑا شہر تھا۔ ڈاک کا انتظام یہاں زیادہ بہتر تھا۔ یوں تو اُس کا دل اِس خط کو کولمبو جا کر پوسٹ کرنے کا چاہ رہا تھا تا کہ جتنی جلدی ہو سکے اُسے پتہ چلے کہ اُس کا بھائی اُسے اِس مشکل سے نکالنے کے لئے فی الفور کون سا قدم اُٹھانے کو ترجیح دے گا۔

بس میں کیا بیٹھا جیسے خیالوں کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ وہ وقت جب اُس کا بھائی ماہ روف بیس سال کی عمر میں امریکا گیا، اُس وقت اُن کے مالی حالات بہت ابتر تھے۔ ترکی سے جرمنی وہاں سے انگلینڈ وہاں سے امریکہ۔ ڈیڑھ سال کے عرصے نے اُس کے پیروں میں جیسے پہیے لگا دیئے تھے۔ جگہ جگہ کا پانی پیتے اور محنت مزدوریاں کرتے کرتے وہ ایک ایسے ملک میں داخل ہوا جس نے شروع میں اُسے رگیدا اور پھر آسائشوں کے دروازے اُس پر کھول دیئے۔ ماہ روف بُہت سعادت مند لڑکا ثابت ہوا۔ جب وہ دھکے

کھاتا تھا تب بھی وہ بھائی کو کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا۔اُس کی اِس مدد نے لاریف ہادی کو بہت سہارا دیا۔اُس کا کاروبار دھیرے دھیرے بہتر ہوتا چلا گیا۔

ماروف نے شادی بھی سری لنکن لڑکی سے کی جو کولمبو میں کھاتی پیتی مسلم کمیونٹی سے تھی۔خُدا نے بچے بھی دیئے،ایک لڑکی اور دو لڑکے۔چند سال قبل وہ مع بیوی بچوں کے آیا تھا۔امریکہ میں رہتے ہوئے بھی وہ سب اپنے مذہبی طور طریقوں کی پابندی کرنے میں پیش پیش تھے۔دس سالہ زہرت نماز کی پابند تھی۔لڑکے بھی اسی انداز میں تربیت یافتہ تھے اور یہ چیزیں ہادی کے لئے بہت طمانیت بخش تھیں۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ پوزین پہنچا۔خط پوسٹ کیا۔ماروف کی طرف سے جب تک اُس کے خط کا جواب نہ آ گیا اُس وقت تک ہادی نے کسی سے اس بابت کوئی بات نہ کی۔جونہی خط اُسے ملا جس میں ماروف نے لاطف کو فی الفور بھجوانے کا لکھا تھا۔ساری ہدایات درج تھیں۔کولمبو جاؤ،فلاں فلاں سے ملو۔فلاں کو میرا حوالہ دو۔کون کون سے کاغذات درکار ہیں۔کہاں کہاں سے ملیں گے؟وغیرہ وغیرہ۔

اُس دن ہادی نے پہلی بار بیوی کے سامنے زبان کھولی پر صرف اس حد تک کہ وہ لاطف کو امریکہ بھیج رہا ہے۔

''پر کیوں؟'' بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ جیسے پھٹ پڑی۔امریکہ تو وہ جائے جس کے پاس یہاں کام نہ ہو۔تمہارا تو اپنے کاروبار کو بیٹے کی شرکت اور ساتھ کا ضرورت ہے۔تم کیوں اپنے ہاتھ کاٹ کر ٹُنڈا ہونا چاہتے ہو۔لاکھ تمہارے ملازم وفادار اور ایمان دار ہیں پر اپنے خون کی بات ہی اور ہے۔جو نگرانی وہ کر سکتا ہے کوئی دوسرا کیسے اس معیار پر اُترے گا۔

ہادی اُسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔وہ سب معاملات رازدارانہ انداز میں آگے

بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ تنظیم اتنی خطرناک تھی کہ کسی بھی ساتھی کے اِدھر اُدھر ہونے کی صورت میں اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا تھا۔ تنظیم میں اُس کی حیثیت کیا تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

بیوی لاکھ سر پٹختی رہی، اُس نے منہ پر قفل لگائے رکھا۔ لاطف سے جب بات ہوئی۔ پہلے تو اُس نے مخالفت کی۔ جوان خون میں جو سرکشی اور جوشیلا پن تھا اُس کی تسکین تنظیم میں شمولیت سے بہت عمدہ طریق سے ہونے لگی تھی۔ ہادی نے سمجھداری سے صورت حال کو سنبھالا۔ امریکہ کے بارے میں ممکنہ حد تک سبز باغ اُسے دکھائے پھر اُسے ساتھ لے کر کولمبو جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوگیا۔ نوے کی دہائی میں سری لنکا کے مقامی باشندوں کا امریکہ جانے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

کولمبو کی مسلم کمیونٹی نے بھی ہادی کی پوری مدد کی اور یوں پندرہ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جس شام اُس نے بیٹے کو جہاز میں سوار کرایا اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

جہاز میں بیٹھے لاطف کے احساسات عجیب سے تھے۔ بیک وقت وہ دو متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کی زندگی کے گزشتہ دو سال جس سنسنی خیزی، ہنگامہ پروری اور تھرل سے دوچار ہوئے تھے اُس نے اُسے زندگی گزارنے کا ایک نیا مفہوم دیا تھا۔ پہلی بار اُس کا کلاس فیلو اور گہرا دوست اجیت جو نسلاً تامل تھا اُسے کینڈی روڈ پر ایک بڑی عمارت کے تہ خانے میں ہونے والے اجلاس میں لے کر گیا۔ جتنی بھی تقریریں ہوئیں وہ سب ظلم واستبداد کے خلاف تھیں۔ سرمایہ داروں اور وزیروں امیروں کے خلاف تھیں جو غریب کو زندگی گزارنے نہیں دیتے اور اُسے کیڑے مکوڑے کی طرح پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ بظاہر تو کچھ ایسا نہیں تھا۔ اُسے وہاں جانا اچھا لگا پھر وہ اکثر اُن کی میٹنگوں میں شریک ہونے لگا۔ ان کے کاز اور سرگرمیوں کو سراہنے لگا مگر کسی کے سامنے نہیں اپنے دل میں، اپنے اندر۔ تنظیم

کے بارے میں سنہالی بدھ اور مسلمان اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ آغاز میں تنظیم تاملوں کے حقوق کی بات کرتی تھی۔ مقبولیت کے ساتھ ساتھ تشدد کے راستے اپنانے لگی۔ تامل ریاست کا مطالبہ ہونے لگا۔ ''را'' سے تعلق جوڑ لیا۔ اور مدراس کے تامل ناڈوں سے مل کر ایک دہشت پسند تنظیم بن بیٹھی۔

پہلی بار جب وہ اُن کے ہیڈ کواٹر ''مولائی ٹیوو'' Mullaitvu اُجیت کے ساتھ گیا۔ گھر میں تو اُس نے دوستوں کے ساتھ مولائی ٹیوو جانے کا کہا تھا۔ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ہادی تو یوں بھی اِن دنوں انورادھا پور گیا ہوا تھا۔

سری لنکا کے شمال اور شمال مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ جافنا سے لے کر Killinochchi, Nallur اور ٹرانکومالی Trincomalee تک گھنے جنگلوں میں اُن کی زیرِ زمین پناہ گاہیں، اسلحہ خانے اور تربیت گاہیں تھیں۔ اُجیت نے اُسے بتایا تھا۔ کہ یہاں ایئر پورٹ بھی ہیں۔ حد درجہ پُراسرار کسی جاسوسی کہانی کیطرح پھیلا ہوا اسکا لمبا چوڑا نیٹ ورک۔ اُجیت کے ساتھ وہ عام جگہوں پر ہی گیا۔ تا ہم فضا میں ایک دہشت کا احساس پایا جاتا تھا۔

کللو چی چی میں نوجوانوں کو خودکش حملوں کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ مولائی ٹیوو میں سیر کرتے ہوئے اجیت اُسے ایک خاص کمرے میں لے گیا۔ یہاں عورتیں بھی تھیں۔ یہیں لاطف نے اُس خوبصورت اور پُرکشش لڑکی کی تصویریں دیکھیں جس نے ابھی چند دن پہلے مدراس میں وزیرِاعلیٰ کی آمد پر بم دھماکا کیا تھا۔ لاطف کی میل ملاقات صرف سطحی لوگوں سے ہی ہوئی تھی۔ پارٹی کے خاص لوگوں کے بارے میں اُجیت بھی نہیں جانتا تھا۔

لاطف کچھ خوف زدہ بھی تھا مگر اندر سے وہ ایسی زندگی کو سراہ بھی رہا تھا۔ ہر جنگ جُو کے گلے میں سائنائیڈ کا کیپسول بندھا ہوتا ہے۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں یہ کیپسول

اس کی حفاظت کا آخری سہارا ہے۔ جسے فی الفور کھا کر وہ مر سکتا تھا۔ گرفتار ہونے کے بجائے موت ان جوانوں کی ترجیح ہوتی۔ یہ سب اجیت نے اُسے بتایا تھا۔

اس پُر اسرار اور خوفناک دُنیا سے واپسی پر لاطف چند دن گُم صُم رہا پھر وہ ان کے اجلاسوں میں جانے لگا۔ پر ابھی باقاعدہ رکن بننے میں اُس کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہونے ہی والا تھا جب قسمت نے اُسے جہاز میں بٹھا دیا اور اب وہ ایک ایسی دُنیا کی طرف رواں دواں تھا جس کے قصے اور داستانیں وہ ہر دوسرے روز سنتا تھا۔

جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائر پورٹ پر لینڈنگ کے لئے پر تول رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے سے چپکی اُس کی آنکھیں نیچے رنگ اور روشنیوں کا ایک سیلاب دیکھ رہی تھیں۔ بُہت سے مرحلوں سے گزر کر وہ باہر آیا جہاں اُس کے چچا اور چچی اُسے لینے اور اُس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ چچا نے اُسے اپنے سینے سے لگایا اور اپنی ستھالی زبان میں اُس کے سفر کے خیریت سے گزرنے کے بارے میں پوچھا۔ ہراساں سے لاطف نے مادری زبان کے ساتھ ہی اپنی بشاشت لوٹتی محسوس کی۔ چچی نے پیار کیا اور اُس کے والدین اور بہن بھائیوں کا پوچھا۔

چند لمحوں بعد گاڑی گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ رات دن کی طرح جوان اور روشن تھی۔ اُس کے چچا کا گھر "برانکس" میں تھا۔ یہ ایک پندرہ منزلہ بلڈنگ کا چوتھا فلور تھا۔ بڑا خوبصورت اور سجا ہوا۔ چچا کے بچے سو رہے تھے۔ چچی نے کھانے پینے کا پوچھا پر اُس نے بتایا کہ جہاز میں اتنی ٹھونسا ٹھونسی ہوتی رہی کہ اب قطعاً گنجائش نہیں اور جب وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں گیا تو تھوڑی دیر تک وہ قدرت کے اِس عجیب و غریب فیصلے پر حیران ہوتا رہا پھر نیند کی وادیوں میں اُتر گیا۔

چچا کے بچوں سے ناشتے پر ملاقات ہوئی۔ اتوار تھا سبھی گھر میں تھے۔ لڑکے تو

خوب ہنسوڑ اور گھلنے ملنے والے بچے تھے۔اُسے دیکھ اور مل کر خوش بھی بُہت ہوئے، پر زہرت چچا کی اکلوتی تیرہ سالہ بیٹی پینٹ قمیض پر اسکارف پہنے ہوئے تھی۔خوش طبع ضرور تھی پر تھوڑا سا لئیے دیئے والی بھی محسوس ہوئی۔

اگلے چند دن اُس نے نیویارک سٹی کی سیر کی۔کبھی چچا کے بیٹوں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔نیویارک کے سب علاقوں میں اسے مین ہٹن سب سے زیادہ اچھا لگا۔یہاں آسمان کو چھوتی ہوئی عمارات، سینما، تھیٹر، بینک، دفتر اور کمرشل پلازوں کی بھر مار نظر آئی۔پندرہ بیس دن اُس نے یہی کام کیا۔چچا نے بھی اُسے کھلی چھٹی دی کہ وہ ماحول کے ساتھ رچ بس جائے اور ہوم سکنس کا شکار نہ ہو۔پھر وہ اپنے چچا کے پیٹرول پمپ اور گیس اسٹیشن پر کام کرنے لگا۔کسٹمرز کو ڈیل کرنے میں اُس کی سمجھ داری، محنت اور ذمے داری نے چچا کو متاثر کیا۔شام کی کلاسز میں اُس نے پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔رات گئے وہ گھر جاتا۔اپنا کھانا گرم کرتا، کھاتا اور سو جاتا۔

ایک دن شام کی کلاس نہیں ہوئی۔وہ جلد گھر آ گیا۔لیونگ روم میں بڑے صوفے پر زہرت نیم دراز کچھ پڑھنے میں محو تھی۔یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے زہرت کو نظر بھر کر کسی قدر تنقیدی انداز میں دیکھا۔عام سری لنکن لڑکیوں کے برعکس اُس کے نقوش بُہت دلکش تھے۔چنبیلی جیسا رنگ بڑی ملاحت لئے ہوئے تھا۔اُس کے بال سیاہ اور لمبے تھے جو اُس وقت اُس کے سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔وہ پڑھنے میں اتنی محو تھی کہ اُسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اُسے یوں دیکھ رہا ہے۔زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اُسے خود بھی اچھا نہیں لگا۔اُس نے ہلکی سی چاپ پیدا کی جس پر زہریت نے چونک کر نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''آج تو آپ جلدی آ گئے ہیں۔'' زہرت نے رسالہ قریبی تپائی پر رکھتے ہوئے اپنی اُلٹی پلٹی نشست سیدھی کی۔

''دراصل آج کلاسز نہیں ہوئیں۔ پر سب لوگ کہاں ہیں؟'' اُس نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ممی اور ڈیڈی ہمی سنی کے ساتھ مسز راحمہ کے گھر گئے ہیں۔وہ شاید اپنا گھر سیل کرنا چاہتی ہیں۔آپ کھانا تو کھائیں گے نا پر لاطف بھائی میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ لوں۔''

زہرت کی خوبصورت آنکھیں کلاک کو دیکھ رہی تھیں اور زبان اس سے مخاطب تھی۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔قریبی ریک پر پڑے رسالوں میں سے ہاتھ بڑھا کراُس نے ایک رسالہ اُٹھایا اوراُس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اُسے تو یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں اُس کا چچا کیوں اتنا رجعت پسند ہے۔چچا چچی اور یہ زہرت اِس ماحول میں کتنے اجنبی سے لگتے ہیں۔

وہ اپنے ماحول سے خاصا مختلف بچہ تھا۔بچپن ہی سے کسی حد تک من مانی کرنے والا، کچھ باغی سا۔ہادی جب بھی اس پر نماز کے لئے سختی کرتا وہ چٹائی پر کھڑا ہوجاتا۔اُٹھک بیٹھک بھی کرتا، پر اگر موڈ نہ ہوتا تو کچھ نہ پڑھتا۔کبھی کبھار باپ کے پُوچھنے پر غلط بیانی بھی کرجاتا۔ماں کے سامنے تو وہ بول بھی پڑتا۔

''آخر آپ لٹھ لے کر ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ جاتے ہیں؟ پڑھ لوں گا نماز اور رکھ لوں گا روزے۔ایک ہی کام رہ گیا ہے آپ لوگوں کا۔'' ماں جواباً بولتی اور کوسنے بھی دیتی۔

اس کھلے ڈُلے ماحول کواُس نے بےحد پسند کیا تھا۔

زہرت نے کھانا میز پر لگا کر اُسے آواز دے ڈالی اور جب وہ کرسی گھسیٹ کر اس

پر بیٹھا تو میز پر سجے ڈونگے میں سالن دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ سرشار سے لہجے میں بولا۔

''ارے یہ ڈوسا کس نے پکایا ہے؟''

''مما اور میں نے۔'' زہرت نے مختصراً کہا۔

اُس کی ماں اپنے علاقے کی یہ خاص ڈش بہت چاہت سے بنایا کرتی تھی۔ جب بھی یہ پکتا وہ تڑپ تڑپ کر کھاتا۔

''زہرت یہ بہت عمدگی سے پکایا ہے۔میری ماں سے بھی اچھا۔'' وہ کھاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔

وہ کام کرتا رہا، پڑھتا رہا پھر اس نے کمپیوٹر انجینئر نگ کے لئے صبح کی کلاسز جوائن کر لیں اور شام کو کام کرنے لگا۔ اپنے مستقبل، اپنی تعلیم اور اپنے کیریئر کے لئے بہت کریزی تھا اور سیر سپاٹوں اور لڑکوں کے ساتھ دوستیاں کرنے میں بھی ماہر تھا۔ پر اس کے ساتھ وہ بہت ذہین اور سوجھ بوجھ والا لڑکا تھا۔ نہ کبھی چچا کو شکایت کا موقع دیا اور نہ کبھی کوئی ایسی صورت پیدا کی جو اُس کے لئے پریشانی اور مصیبت کا باعث بنتی۔ ایشیائی لوگوں کے ساتھ نت نئے دن جو کچھ ہوتا وہ اُس کی آنکھیں کھولنے کو کافی تھا۔

چھ سال وہ اپنے چچا کے ساتھ رہا۔ اپنی ذہانت، ذمے دارانہ رویے، کام اور پڑھائی کے ساتھ لگن جیسی اچھی خوبیوں کے باعث وہ اپنے چچا اور چچی کو متاثر کرنے اور اُن کی خصوصی محبت حاصل کرنے میں بہت کامیاب رہا اور جب اُس نے انجینئر نگ کی تعلیم مکمل کر لی اور اچھی کمپنیوں میں اپلائی کر دیا اور شکاگو کی ایک بڑی کمپنی میں انٹرویو بھی دے آیا تو اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ اُسے ایشیائی ہونے کے باوجود اِس بہترین پوسٹ کے لئے سلیکٹ کر لیں گے، پر کمپنی کا جو بورڈ انٹرویو کے لئے بیٹھا تھا اُنہوں نے اُس کے سانولے

وجود میں ایک زرخیز اور تخلیقی ذہن کا اندازہ لگا لیا تھا۔اِس میں شک نہیں کہ جب خوشی سے بھرپور لہجے میں اُس نے یہ خبر اپنے چچا کو سنائی تو جہاں اُسے اُس کی ذات پر فخر محسوس ہوا وہیں تھوڑا سا اُس کے چلے جانے کی صورت میں رنج بھی ہوا۔

زہرت کے لئے وہ ایسے ہی ہیرا سے لڑکے کا خواہش مند تھا۔شروع میں اُس کا خیال تھا کہ وہ شاید زہرت میں دلچسپی لے پر وہ تو ہمیشہ کام سے کام رکھتا۔

اپنے بھائی سے وہ یہ بات کر بیٹھا تھا۔بھائی نے لاطف کو لمبا چوڑا خط بھی لکھا تھا کہ بھلا اُس کے لئے زہرت سے اچھی کون سی لڑکی ہو سکتی ہے؟ خط پڑھ کر اُس نے چند لمحوں کے لئے سوچا اور پھر اُسے ڈسٹ بن میں ڈال کر اپنے آپ سے کہا۔

''کمال ہے ذرا دیکھو تو اِن کی سوچوں کو۔ٹھیک ہے زہرت اچھی لڑکی ہے مگر اتنی مذہبی لڑکی سے میرا گزارہ بُہت مشکل ہے۔''

اُس نے باپ کو خط لکھ دیا کہ وہ فی الحال شادی جیسے کسی موضوع پر کوئی بات یا سوچ بچار کے لئے تیار نہیں۔اُسے ابھی آگے بڑھنا ہے۔وہ اپنی ذاتی کمپنی بنانے میں کوشاں ہے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اُسے یقین ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوگا۔

ہادی دل سے چاہتا تھا کہ بیٹا کسی طرح اِس رشتے پر راضی ہو جائے۔وہ بھائی کا احسان مند تھا، پر لاطف کی دوٹوک تحریر اور فون پر دوٹوک گفتگو نے اُس پر واضح کر دیا کہ وہ اُس پر راضی نہیں۔یوں اپنے طور پر وہ کبھی کبھی اُسے ضرور لکھ دیتا۔

زہرت جب سری لنکا گئی تو نایا نائی سے بھی ملی۔ہادی اُس کے انداز و اطوار دیکھ کر دنگ ہی تو رہ گیا۔پہلے ایک دوبار جب آئی تو بچی تھی لیکن اب جوان ہو چکی تھی۔کس قدر شائستہ اور مہذب، ادب آداب والی شائستہ سی لڑکی۔ہادی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔جب وہ گھر آیا تو اُس نے بیٹے کو لمبا چوڑا خط بھی لکھ دیا کہ ایسی لڑکیاں نصیب والوں کو ملتی ہیں۔زہرت کا

ساتھ اُس کی زندگی کو جنت بنا سکتا ہے۔

لاطف یہ خط پڑھ کر بُہت ہنسا۔سگریٹ سُلگا کر اُس نے کش لیا اور اپنے والد کو تصور میں لا کر بولا۔

''میرے پیارے ڈیڈی آپ کس جنّت جہنّم کے چکر میں پڑ گئے ہیں؟جنّت لے کر کیا کرنی ہے،میرے جیسے آدمی کے لئے دوزخ ہی ٹھیک ہے۔''

چند دنوں بعد ایک دن اُس کے چچا کا فون آیا۔

''بھئی لاطف تم نیویارک کا چکر لگا لو۔زہرت سری لنکا سے آئی ہے،تمہارے امی ابو نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں تمہارے لئے۔ہمیں مل بھی جاؤ اور اُنہیں لے بھی جاؤ۔''

وہ جس دن نیویارک آیا،آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔زہرت گھر پر نہیں تھی۔چچا بھی نہیں تھے۔چچی نے محبت سے استقبال کیا اور اُس کے بُہت کم آنے کا گلہ کیا۔

''اب شکاگو کو تو یوں لگتا ہے جیسے تم نے لاس اینجلز بنا لیا ہے۔کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں آئے نہیں۔''

''ارے چچی مصروفیت،کام۔۔۔کام۔۔۔میں اب اپنا کام بھی تو سیٹ کر رہا ہوں۔ہاں یہ زہرت کدھر ہے؟''

''یونیورسٹی میں کوئی سیمینار تھا۔بس آتی ہی ہو گی۔''

کوئی گھنٹے بعد اُس نے زہرت کو اندر آتے دیکھا۔پر ٹی وی لاؤنج میں جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں آنے کے بجائے وہ اُوپر چلی گئی۔باہر پھوار پڑ رہی تھی۔عین ممکن ہے بھیگ گئی ہو اور چینج چاہتی ہو۔اُس نے سوچا۔

اور واقعی یہی بات تھی تھوڑی دیر بعد وہ سُرخ اور سیاہ پھولوں والی میکسی پہنے اندر

آئی۔میکسی پر ہلکے شوخ پھولوں کی طرح اُس کا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔کس قدر بشاشت تھی اُس کے لہجے میں جب اُس نے ماں کو چائے کی ٹرالی گھسیٹتے دیکھا۔

''ارے واہ کتنی طلب تھی اِس وقت چائے کی۔''

لاطف اُس کی لانبی چوٹی کو کمر پر جھولتے دیکھ رہا تھا۔سیاہ اسکارف کی ناٹ اُس کے گلے میں تھی۔اب وہ لاطف کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تو آپ اپنی چیزیں لینے آئے ہیں۔ویسے تو آنے کی قسم کھائی ہے۔''

لاطف ہنسا اور بولا۔

''یہ تمہیں سری لنکا جانے کی کیا ہڑک اُٹھی۔'' اُسے اپنے باپ کے اصرار بھرے خطوط یاد آئے تھے۔

''کمال ہے، ہڑک کیوں نہ اُٹھے وطن ہے ہمارا۔سارے رشتے تو وہیں سے جُڑے ہوئے ہیں۔دراصل جینی بھی جا رہی تھی۔تمہیں تو معلوم ہی ہے۔سیاحت اُس کی ہابی ہے۔''

جینی ان لوگوں کے ہمسائے میں رہتی تھی۔سیر سپاٹوں کی دلدادہ۔نئی دنیائیں دیکھنے کی شوقین۔لاطف اُسے تب سے جانتا تھا جب وہ یہاں رہتا تھا۔

میں نے تو بہتیرا زور مارا تھا کہ مت جاؤ۔سیاحوں کیلئے ابھی حالات سازگار نہیں۔پرتم تو جانتے ہی ہو وہ کیسی نڈر اور جیالی لڑکی ہے۔تنک کر بولی تھی۔

''لو مجھے ڈراتی ہو۔ایک سری لنکا کیا۔دنیا بھر میں دہشت گردی کی لہر رقص کر رہی ہے اب اِس ڈر سے کہیں جانا چھوڑ دیں۔''

''کیا حالات ہیں اب؟''

''کمزور ملکوں کے حالات کا کیا کہنا؟بڑے ہمسائے ملک نگل لینا چاہتے ہیں

نہیں۔اب کوئی پوچھے انڈیا سے کہ ذرا سی چنگاری تھی اُسے ہوا ہی نہ دو ہوا بھی دی اور تیل بھی چھڑکا۔بھڑکایا اور اب فوجیں اُسے بجھانے کو اُتار دیں۔عالمی منظر نامے کے رنگا رنگ تماشے۔

''ویسے ایک بات!''

زہرت نے چائے کا کپ ماں کے ہاتھوں سے پکڑا، چھوٹا سا سِپ لیا اور بات کو جاری رکھا۔

''سری لنکن اگر کہتے ہیں کہ A Land Like No Other تو یہ غلط نہیں۔چھوٹے تھے تو ایک دفعہ گئے تب اتنا شعور نہیں تھا پر اب تو حُسنِ فطرت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔سچی بات ہے سری لنکا کا قدیم تہذیبی ورثہ دیکھ کر مجھے تو فخر محسوس ہوا۔جیننی تو میوزیم میں زیورات کا سیل دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔''

''پر کچھ انسانوں کا بھی بتاؤ کہ وہ کیسے لگے؟''

لاطف ہنسا، اُس کے لہجے میں شوخی تھی اور کسی قدر طنز بھی۔

''اُوپر والے کی تخلیق پر میں کون ہوتی ہوں رائے دینے والی۔ویسے وہ اگر صورتاً اچھے نہیں لیکن سیرتاً تو کمال کے ہیں۔ایسے محبت کرنے والے کہیں دیکھے ہیں تم نے۔''

''کہاں کہاں گئیں، کون کون سی جگہیں دیکھیں؟''

''کینڈی، سگریا، نویرا علیا، آدم پیک۔انورا دھاپور، جافنا اور راستوں میں پڑنے والے سب چھوٹے بڑے شہر۔''

''مائی گاڈ تم آدم پیک گئیں!'' لاطف کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

تبھی زہرت لاطف کو کھانے کے لئے اُٹھنے کے لئے کہتے ہوئے بولی۔

''مما ڈیڈی کے ساتھ بہت ملکوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔نماز کے لئے ڈیڈی

کے ساتھ اُٹھنے کے بعد ہم دونوں تو پھر کبھی نہیں سوتے تھے، گھومنے پھرنے ہی نکلتے سچی بات ہے ایسی نشیلی صبحیں دیکھنے کو ملتیں کہ لطف آ جاتا۔ لیکن سری لنکا کی صبحوں کا جواب نہیں۔

''خیر یہ بات بھی درست نہیں۔ اسکنڈے نیوین ممالک کی صبح شامیں اپنے اندر حُسن کے خزانے رکھتی ہیں۔ یہ چونکہ ہمارا وطن ہے اس لئے اِس کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی بھی ہے جو اس کی ہر چیز کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔''

''پر چند باتوں نے مجھے اس بار شدید متاثر کیا ہے۔ سچی بات ہے میں تو اس پر سنجیدگی سے کام کرنے کو پلان کر رہی ہوں۔''

''مثلاً'' لاطف نے حیرت سے زہرت کو دیکھا۔

''سفر کے دوران میں نے جب بھی نماز کی ادائیگی کے لئے راستے میں نظر آنے والی کسی مسجد کا رُخ کیا۔ مجھے مسجد کے اندر نماز کی ادائیگی سے روکا گیا۔ مولویوں کی یہ تنگ نظری مجھے بہت کھلی۔ چندے کا مطالبہ بھی کئی جگہ ہوا۔ میرے اس احتجاج پر کہ میں تو ان مقدس جگہوں پر سجدہ دینا چاہتی ہوں جہاں ہر روز پانچ بار مختلف پیشانیاں اپنی عبودیت کے اظہار کے لئے جھکتی ہیں، پر میری یہ بات ان کے کھوپڑوں میں گھستی ہی نہ تھی۔ سمجھتے تھے، ملحقہ کسی چھوٹے سے کمرے میں دھکیلنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ پردے کا اہتمام رہے۔ بھاڑ میں گیا پردہ۔

روشن خیالی، وسعت نگاہی، ذہنی اُفق کی بلندی اور مذہبی روح کو سمجھنے کے لئے ان کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ازحد ضروری ہے۔ دوسری بات جس نے مجھے شدید تکلیف دی وہ مسلمان بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لاپروائی تھی۔ ملک میں موجود تینوں فرقے ہندو، عیسائی اور بدھ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بہت کریزی ہیں۔ چند ایسی تنظیمیں جو مسلمانوں کی بہبود کے لئے کام کر رہی ہیں میری اُن سے ملاقات ہوئی اور یہ نقاط میں نے وہاں اُٹھائے۔

اُنہوں نے بھی اعتراف کیا کہ واقعی اس میدان سر ی لنکن مسلمان پیچھے ہیں۔ میں تو انشاءاللہ اب اس پر کام کرنے والی ہوں۔''

''مسلمانوں کی انتہاپسندی لبرل ازم اور سیکولر سوچ سے نارمل ہو سکتی ہے۔ترقی کے لئے سیکولر ہیومونسٹ ہونا بے حد ضروری ہے۔'' لاطف نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سیکولر کیوں؟ مسلمان اپنے مذہب کی روح کو سمجھیں۔''

بحث شاید طول پکڑ جاتی جب زہرت کی ماں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ بس بُہت باتیں ہو گئیں ۔۔۔ اب کھانا کھاؤ۔''

لاطف کھانے میں مصروف تھا جب زہرت نے یہ کہا۔

''مجھے تو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور میرا مذہب میری پہچان ہے۔''

لاطف کے چہرے زاویے بگڑے تھے۔کھانے کے عمل نے اس ناگواری کو چھپا لیا تھا۔ورنہ تو اُس کے تاثرات بُہت نمایاں ہوتے۔

تاہم پھر بھی وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''مسلمان تو دنیا بھر میں رسوائے زمانہ ہیں۔شرم آتی ہے خود کو مسلمان کہنے پر۔دہشت گردی میں بڑا نام پیدا کر رہے ہیں۔''

زہرت تلملائی۔اور پھٹ سے بولی۔

تمہاری محبوب تنظیم لبریشن ٹائیگر زاف تامل ایلام نے تو خیر سے سبھوں کو مات دے دی ہے ایسی جیالی نکلی پہلے القاعدہ کی ہمرازبنی۔اُس سے یارانہ گانٹھا۔کچھ سبق پڑھے کچھ چالیں سیکھیں۔پھر ایسے تخلیقی جنگی معرکے مارے کہ اُسے بھی پیچھے چھوڑ گئی خودکش حملوں کی نئی تکنیک ایجاد کر ڈالی۔دنیا بھر سے اپنی انفرادیت منوالی۔چوٹ تو گہری تھی۔تاہم ہنستے

ہوئے بولا۔ ''تاریخ کی دُرستگی بہت ضروری ہے۔ خودکش حملے تاملوں کی ایجاد نہیں خیر سے زاروں کے ستائے ہوئے ماٹھے غریب روسیوں کے جذبات کا اظہار تھے۔''

شاید دونوں میں تلخی پھر بڑھ جاتی۔ زہرت کی ماں نے کہا۔

''تم لوگ کن باتوں میں اُلجھ گئے ہو۔ کھانے کو زہر کر رہے ہو۔''

ہلکی پھلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہتے ہوئے موضوع بدلوادیا۔

لاطف کو شاید یہ اعتراف کرنے میں اپنی سُبکی محسوس ہوئی تھی کہ اُس کا اب تامل ٹائیگرز سے کیا واسطہ اور رابطہ۔ انٹرنیٹ سے کبھی کبھار کی حاصل کردہ معلومات اُس کے لئے کچھ اتنی دل خوش کن نہ تھیں۔ تنظیم کے بانی رکن ویلو پلائی پر بھا کرن کے بارے میں جانکاری کا رخ بھی کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔ وہ مذہبی گھرانے کا پرُوردہ تامل ہندو لڑکا جس کا باپ اُسے بڑا افسر دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ بڑا پڑھا کو تھا تو دوسری طرف تخلیقی و تخریبی ذہن کا مالک بھی تھا۔ اسکا نیٹ ورک۔ دنیا بھر میں اس کے رابطے۔ غیر قانونی منشیات، مختلف کمپنیوں میں غیر قانونی سرگرمیوں، غیر قانونی تارکین وطن کی منتقلی اور سمگلنگ جیسے قبیح دھندے تنظیم کی آمدنی کے ذرائع تھے۔ اُس نے پلٹ کر کبھی اپنے اُس ماضی میں جانے یا جھانکنے کی خواہش نہیں کی تھی جس کے لئے وہ اپنے باپ سے اُلجھا تھا۔

لاطف اگر محنتی تھا تو قسمت کا دھنی بھی تھا۔ شکاگو آنا اُس کے لئے بہت بابرکت ثابت ہوا تھا۔ اپنی منزل کی طرف وہ سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ پیسے عہدے مرتبے اور خوشحالی نے اُس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔

سانولا سلونا کمزور سا لڑکا جو تاڑ جیسا نظر آتا تھا اب ایک دلکش نوجوان کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بہت سی لڑکیوں سے اُس کی دوستی تھی۔ شادی کی اُسے قطعی جلدی نہ تھی۔ یہ کام کہیں اُس کے مستقبل بعید کے کسی شیڈول میں تھا۔ زہرت کسی بھی طرح رو کئے

جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ حد درجہ دلکش اور پسندیدہ اطوار کی حامل ہونے کی بنا پر وہ ہر بار اُسے بیک ورڈ کہتے ہوئے اپنے دل میں رَد کرتا تھا۔ جب وہ واپس شکاگو آ رہا تھا اُس نے زہرت کے بارے میں اپنے آپ سے کہا تھا۔

''اُف میرے خدا کس قدر جنونی ہے یہ۔''

تھوڑا سا وقت اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس نے اور کامیابیاں حاصل کیں۔ چچا سے بس کبھی کبھار فون پر ہی بات ہوتی۔ زہرت کے بارے میں چچا سے ہی سننے میں آیا کہ اُس نے ایک این جی او بنائی ہے۔ سری لنکا میں وہ تعلیم پر بُہت کام کر رہی ہے۔

یہ سال 1990ء اور مہینہ اکتوبر تھا۔

وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں نیویارک آیا ہوا تھا۔ نیویارک بارشوں کے پانیوں سے دُھل دُھلا کر نکھرا ہوا تھا۔ گاڑی کوئینز بولیوارڈ پر بھاگتی ہوئی جانسن ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ مین ہٹن کا یہ علاقہ اُسے بُہت پسند تھا۔ سہ پہر سونے میں گزاری اور شام کو وہ سیر سپاٹے کے لئے نکل آیا۔

پہلے اس نے چچا کے گھر جانے کا سوچا۔ پھر اس خیال کو جھٹکتے ہوئے وہ خود سے بولا۔

''ہٹاؤ یار، وہاں جا کر بور ہونے سے بہتر ہے فورٹی سیکنڈ سٹریٹ چلوں اور شام بھی اچھی گزاروں اور کچھ خریداری بھی کروں۔ جرابوں اور چند ٹائیوں کی ضرورت ہے۔''

گھومتے گھومتے وہ ٹائمز اسکوائر آ گیا۔ درمیان کی گول سی بلڈنگ پر زپیر چل رہی تھی۔ ساری دُنیا کی اہم تازہ خبریں ایک پٹی کی صورت چمکدار حروف میں سامنے آ رہی تھیں۔ اس کا تو قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا اِن خبروں کو دیکھنے کا۔ پر جانے کیسے نظر اُٹھ گئی اور جو اُٹھی تو اُٹھی رہ گئی۔ کسی سنگی بت کی طرح وہ جہاں کھڑا تھا کھڑا رہ گیا۔ ٹائمز اسکوائر، اس

میں گھومتے پھرتے لوگ سب جیسے اوجھل ہو گئے۔صرف ایک چیختی چنگھاڑتی خبر تھی جس نے اُس کی آنکھوں کو، اُس کے اعضا اور اُس کے وجود کو ساکت کر دیا تھا۔

سری لنکا کے شمالی علاقوں کے اہم شہروں اور قصبوں سے تامل ٹائیگرز اور اس کی ذیلی تنظیم بلیک ٹائیگرز کے مسلح فوجی دستوں نے سنگینوں اور بندوقوں کی نوک پر ان علاقوں کے مسلمانوں کے گھروں پر قبضہ کر کے اُنہیں باہر نکال پھینکا ہے۔سری لنکا کے ان شہروں میں ابتر صورت کے پیش نظر امن و امان کی حالت سخت مخدوش ہے۔

سائیں سائیں کرتے کان، دھڑ دھڑ کرتا اُس کا دل اور زیپر پر رقصاں اُس کی نگاہیں سب جیسے اِس خبر کی صداقت سے انکاری تھے۔بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔پر وہی خبر اب پھر سامنے تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس پر یقین کرے۔

پھر جیسے وہ پاگلوں کی طرح بھاگا۔اُسے یہ بھی نہ خیال آیا کہ فون پر وہ اپنے چچا سے بات کرے۔اُس نے ٹیکسی پکڑی اور برانکس کا کہہ کر نیم دراز ہو گیا۔اُس کے دل و دماغ میں جیسے آندھیوں کے جھکڑ تھے۔جافنا، مینار، کلونچی، ویبانیا اور مولاناوی کے مسمانوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔امن پسند صلح جو قسم کے یہ لوگ جو کبھی کسی جھگڑے میں ملوث نہیں ہوئے، ہمیشہ اپنے کام سے کام اور اپنی کمیونٹی کی فلاح و بہبود میں خود کو مصروف رکھتے تھے۔

تاملوں اور سنہالیوں کے درمیان کبھی کبھار کے جھگڑوں میں ہمیشہ اس گروپ کا ساتھ دیتے جو انصاف پر ہوتا۔

اُس کے چچا کا گھر لاک تھا۔یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ اُس نے گہرے دُکھ سے سوچا۔

پیٹرول پمپ فون کرنے پر اُن کے منیجر سے پتا چلا کہ چچا کی ساری فیملی آسٹریلیا

گئی ہوئی ہے۔واپسی پر اُن کا ارادہ سری لنکا ہو کر آنے کا بھی ہے۔

اُس نے جافنا فون کیا۔کوئی جواب نہیں تھا۔اُس کا باپ، اُس کے بھائی بہن اُس کی ماں کہاں ہوں گے؟ زندہ بھی ہیں یا نہیں پھر اُس نے کولمبو چچا کے سُسرال فون کیا۔ چچا کے سالے کی بیوی نے بتایا۔

''ابھی تو کچھ پتا نہیں۔سری لنکن فوج نے ایکشن تو لے لیا ہے پر ابھی حالات بُہت مخدوش ہیں۔مسلمانوں پر بڑا کڑا وقت ہے۔اِن دہشت گردوں نے تو انہیں اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنا کوئی سامان بھی اُٹھا سکتے۔''

وہ شکاگو واپس آ گیا۔وہ سری لنکا جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا، ان چند دنوں میں جب وہ اپنے بزنس معاملات اور دیگر اُمور کو اپنی عدم موجودگی میں نمٹانے کے بندوبست میں مصروف تھا اُس نے کتنی بار سوچا، کتنی بار اس تلخ احساس نے اُس کو کچوکے لگائے کہ یہ وہی تامل ٹائیگر زلبریشن ہے جسے وہ حق پر سمجھتا تھا جس کے کاز سے اُسے ہمدردی تھی جسے وہ ممبر بن کر اپنی خدمات سونپنا چاہتا تھا۔وہ کیسا احمق تھا؟ کس قدر بےوقوف اور گھامڑ تھا۔

وہ بس نام کا مسلمان تھا۔پر اس حادثے نے اسے اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کی مسلمانیت جیسے جوش کھا کر تڑپی تھی۔اُس کا باپ کتنی صحیح بات کہا کرتا تھا۔یہ ہنود و یہود کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔

ان دنوں وہ کس اذیت سے دوچار تھا اس کا اندازہ صرف اُسے ہی تھا۔اُس کی سیکولر کیمونسٹ سوچوں کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔بین الاقوامی میڈیا پر اُس کی صرف ایک خبر تھی۔کتنے گھر بے گھر ہوئے۔کتنے معصوم اور بے گناہ مارے گئے۔کچھ علم نہ تھا۔اس کھلی جارحیت پر کہیں احتجاج نہیں تھا۔جانے سے ایک دن پہلے اُس نے کولمبو فون کیا۔اُس کے چچا چچی سب مع زہرت کے وہاں آ چکے تھے اور کولمبو میں اپنے گھر میں مقیم تھے۔اُس کے

والدین اور بہن بھائی سب اُس کے چچا کے پاس تھے ۔دو دن پہلے اُس کے چچا انہیں کینڈی کے کیمپ سے لائے تھے ۔ زہرت ان دنوں کیمپوں میں امدادی پارٹیوں کے ساتھ دن رات کام کر رہی تھی ۔یہ بات اُسکے والد نے اُسے فون پر بتائی تھی ۔

اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے بات کر کے اُسے قلبی سکون تو ضرور ملا تھا، پر جیسے وہ اندر سے جل رہا تھا ۔اتنا بڑا ظلم! کیوں اور کس لئے ؟

رات کے تین بجے وہ بندرانائیکے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اُترا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ۔دس سال بعد اُس نے اپنے وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھا تھا ۔یورپ کے ائرپورٹوں کے مقابلے میں یہ کس قدر چھوٹا اور چمکتی دمکتی شان وشوکت سے عاری تھا ۔

میجسٹک سٹی میں چچا کا خریدا ہوا خوب صورت گھر جو ابھی خاموشی کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا ۔اُس کے اندر پاؤں دھرنے کے ساتھ ہی جاگ اُٹھا تھا ۔دُکھ، کرب اور اذیت کے وہ مشترکہ محسوسات جن سے وہ سب اپنی اپنی جگہ دوچار ہوئے تھے ۔مل بیٹھنے اور باتیں کرنے سے قدرے سکون پذیر ہوئے ۔

''آخر ایسا کیوں ہوا؟'' اُس نے اپنے باپ سے سوال کیا ۔

''مسلمان طبقے کا بااثر ہونا اُنہیں کھلتا تھا ۔انہیں وسطی حصوں میں دھکیل کر وہ پورے لنکا میں ایک اشتعال انگیز صورت حال پیدا کر کے مسلمانوں کو بقیہ فرقوں سے لڑانا چاہتے تھے تا کہ اُنہیں بالکل بے اثر کیا جا سکے ۔''

ہلکے سے ناشتے کے بعد وہ سو گیا تھا ۔رات کے کھانے پر ماں نے اُسے اُٹھایا ۔وہ جب گہری نیند اور اس کی مدہوشی سے قدرے باہر ہوا اُسے زہرت کی آواز سنائی دی تھی ۔

اور ایسا پہلی بار ہوا کہ اُس آواز کے سُنتے ہی اُسے اپنی دھڑکنوں میں ارتعاش سا محسوس ہوا ۔چند لمحے وہ ساکت لیٹا اُسے سنتا رہا ۔وہ کسی کیمپ کا حال سُنا رہی تھی ۔

وہ اُٹھا، واش روم میں جا کر اُس نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر باہر آیا۔ کاہی رنگی ساڑھی میں وہ صوفے پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

سفر کی تھکاوٹ کا ہلکا سا عکس اُس کے چہرے پر تھا پر لہجے میں تیزی اور گفتگو میں زور تھا۔ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ یقیناً یہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی وہ ہمیشہ اُسے دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر بکھیرا کرتی تھی۔

مگر لاطف کی نظریں آج وہ نہیں تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ زہرت نے نقشے کے ذریعے ان تمام مقامات کی نشان دہی کی جہاں جہاں مسلمانوں کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ اسے تقریباً ہر کیمپ کی حالت کا علم تھا کہ کہاں کس کس چیز کی ضرورت ہے؟ اس بھاگ دوڑ میں کولمبو کی پوری مسلم کمیونٹی سرگرم عمل تھی۔

گھر کے بقیہ لوگ تو سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ لاطف کی ماں نے اُسے زہرت کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اُٹھ گئی۔

دفعتاً باتیں کرتے کرتے لاطف نے کہا۔

''زہرت میں بھی اس مشن میں تمہارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔''

حیرت زدہ سی زہرت نے اُسے دیکھا۔

''ہوش میں تو ہونا۔''

وہ مُسکرایا۔ زہرت کا حیرت زدہ ہونا اُسے سمجھ میں آتا تھا۔ وہ اُس کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھی۔

''بالکل ہوش میں ہوں اور بقائمی ہوش وحواس تمہارے مشن میں ایک ادنیٰ کارکن کے طور پر کام کرنے کا خواہش مند ہوں۔''

''پر لاطف میں تو اپنے مشن کو دُنیا بھر میں ہر اُس جگہ لے جانا چاہتی ہوں جہاں

مسلمان مظلوم ہیں۔سری لنکا میرے والدین کا وطن ہے۔اُس کے ہم پر حقوق ہیں۔پر مجھے وطنیت کی سطح سے اُوپر اُٹھ کر کام کرنا ہے۔رنگ اور نسل کی سطح سے بالاتر ہو کر۔''

''میں اور میرے سب وسائل تمہارے ساتھ وہاں تک چلیں گے جہاں تک تم ہمیں لے جانا چاہو گی، زہرت!'' لاطف کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔''زہرت'' کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بڑی بوجھل آواز میں بولا۔

''میں نے تو اپنے دل کے دروازے تم پر بند رکھے۔حالانکہ تم میں اندر جانے اور وہاں رہنے کی ساری خوبیاں موجود تھیں، پر میں تو خود کو ہی بھلائے بیٹھا تھا۔''

اُس نے زہرت کا ہاتھ اپنے بھاری ہاتھوں میں تھاما اور بولا۔

''میں معافی چاہتا ہوں زہرت۔''

زہرت کی آنکھوں میں شبنم اُتر آئی تھی۔

اپنے باپ کی طرح لاطف اُس کی بھی پسند تھا، پر اُس نے کبھی اس پسندیدگی کا ہلکا سا اظہار کرنا بھی پسند نہ کیا۔اُس کا ہاتھ لاطف کے ہاتھوں میں تھا۔

''ہم تو اپنے دشمن آپ بن بیٹھے ہیں۔وہ آفاقی پیغام جو ہماری اساس ہے، اُس کی روح کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے سے انکاری ہیں۔رنگوں، نسلوں، فرقوں، گروہوں میں بٹے ہوئے، اپنے مرکز سے بھٹکے ہوئے، معجزوں کی توقعات میں زندہ، عمل سے عاری لاشے ہیں۔''

''لاطف تم نے مجھے اپنا آپ دیا ہے، میں بُہت خوش ہوں۔آؤ چھوٹا سا دیا جلائیں اور اُسے اِن دیوں میں شامل کریں جو کہیں کہیں جل رہے ہیں۔شاید یہ ایک قافلہ بن جائے اور شاید کہیں کوئی صلاح الدین ایوبی اس قافلے کی مہار اپنے ہاتھ میں تھام لے۔''

لٹنا میرا استنبول کے کیپلی کارسی میں۔

اتاترک ائیر پورٹ پر جونہی میری متجسس آنکھوں نے دائیں بائیں اور مضطرب قدموں نے منی چینج آفس کی تلاش میں آگے پیچھے ہلنے کی کوشش کی سیما پیروز نے کسی قدر خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''کمبخت ذرا دم تو لے لو۔ چھری تلے گردن آگئی ہے تیری کیا۔ رات بھر کے سفر نے ادھ موا کر دیا ہے۔ ہوٹل والوں کا کوئی بندہ بھی باہر انتظار میں ہوگا۔ چھوڑ گیا تو اور سیاپا پڑ جائے گا۔ پہلے ٹھکانے پہنچو صورت حال کو واضح ہونے دو۔ یورو (یورپین کرنسی) ڈالر کا پتہ تو چلے۔ ریٹ کیا ہیں؟ ناواقفیت میں کہیں ہاتھ ہی نہ ہو جائے۔''

بات تو ٹھیک ہی تھی۔ سو ٹھک سے دل کو لگی۔ ''چلو اچھا'' کہتے ہوئے میں نے ٹرالی کا رُخ باہر جانے والے راستے کی طرف موڑ دیا۔

آربوائے ہوٹل میں ریسپشن پر کھڑی لڑکی بڑی چھمک چھلو قسم کی چیز تھی آنکھیں تو گویا ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں۔ کسی لگی لپٹی اور لحاظ کے بغیر صورت کو واضح کر دیا۔ ایک یورو 1.74 اور ایک ڈالر 1.35۔ جبکہ بینک سے اس کا 1.85 اور 1.45 ملنے کا امکان تھا۔

لیکن دن اتوار کا تھا اور بینک بند۔ سیما نے سویورو کو بدلوایا اور کھاتے کو مشترکہ کر دیا۔

پر حضرت ابو ایوب انصاری کے مزار کی زیارت اور شام کو باسفورس کے آخری دہانے پر بیٹھ کر ہواؤں کے جھلار میں آبنائے کے اندر سٹیمر جہازوں میں لوگوں کی لدلدائی اُتر ائی اور اُس کے دونوں کناروں پر پھیلے ایشیا اور یورپ کی خوبصورتیوں سے اپنی آنکھیں سینکتے اور اپنے ارد گرد بھنی مچھلی، برگر، اُبلے بھٹوں اور بہت سی ایسی دوسری چیزوں جن کے ذائقوں اور ناموں سے شناسائی نہ تھی کی خوشبوئیں سونگھتے مجھے احساس ہوا تھا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خریداری کے لیے بیگ میں سے نوٹ نکالنے، دینے، لینے، ہتھیلی پر رکھی غیر ملکی ریز گاری گننے اور حساب کتاب کرنے میں تھوڑا سا بھبھالڑانے کا تو ایک اپنا چارم ہے۔

سورج کی الوداعی کرنیں تاحد نظر پھیلے پانیوں کو زرنگار بنانے کے بعد اب کہیں اور اپنی جلوہ گری کی نمائش کے لیے رُخصت ہوگئی تھیں۔

اذان کی دلکش آواز نے میرے سارے سر یر میں وہ لطیف اور گداز سا ارتعاش پیدا کیا تھا جس نے مجھے وحدت ملّتِ اسلامیہ کی اُس زنجیر میں پروئے ہوئے ہونے کا احساس دیا جو رنگ نسل اور جغرافیائی حدوں سے بالا ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب میرا مُوموعدنان میندریس کا شکر گزار ہوا جس نے اقتدار میں آنے کے بعد عصمت انونو کے ترکی زبان میں دی جانے والی اذان کے حکم کو ختم کیا۔

''اب اگر یہ اس وقت تُرکی زبان میں ہوتی تو میرے پلّے کیا خاک پڑنی تھی۔اِس اجنبی سرزمین پر اپنائیت کی میٹھی سی جذباتی کیفیت بھلا کیوں کر پیدا ہو سکتی تھی؟''

اللہ اکبر اللہ اکبر میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اُٹھتے ہوئے سیما سے کہا۔

''آؤ سجدہ کریں قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی اُس سرزمین پر جس کی فتح کی

بشارت میرے پیارے نبیؐ نے دی تھی۔''

اور جب میں ایمی نونوئی جامع (مسجد) کے اندر اُس کے طرزِ تعمیر اور تزئین کاری کے حُسن جمال کو دیکھتی تھی۔ مجھے کچھ یاد آیا تھا۔

''ہاں سیما دیکھو صبح سب سے پہلا کام کرنسی بدلوانے کا کرنا ہے۔''

پر جب رات کو ٹرام میں سفر کے مزے لُوٹتے ہوئے ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ ریسپشن پر کھڑے لڑکے نے ایک بروشر ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا۔ جس میں شہر کی خوبصورت جگہوں کی سیر کا پیکج تھا۔

میں نے بے اعتنائی سے اُسے دیکھا۔ چھوٹتے ہی انکار کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ کسی بھی جگہ کی سیر کے لیے میرا طریق کار ہمیشہ بڑا مختلف رہا۔

پر مجھے مڑ کر دیکھنا پڑا تھا۔ سیما اپنی جگہ جمی کھڑی تھی۔ حسین تھی۔ چہرے پر غصے اور رعونت کے آڑھے ترچھے عکس بکھرے ہونے کے باوجود بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ کہیں میرے جیسی صورت ہوتی تو نری چمارن لگتی۔

وہ غرائی تھی۔

''نہ تمہیں خجل خوار ہونے کا بڑا چاؤ ہے نہ تو وہ بھی ہو لیں گے پر رکو تو سہی ذرا۔ شتر بے مہاروں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے چلو کسی گروپ کے ساتھ نتھی ہو جائیں اور قاعدے طریقے سے کچھ دیکھ لیں۔''

اُسکے پاس باتوں اور دلائل کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ سب میرے نزدیک فضول تھے۔

دیکھو نہ کتنے لوگ دھڑا دھڑ بکنگ کروا رہے ہیں۔ یہ سب پاگل تو نہیں۔

بہر حال میں نے اُس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے 50 یورو فی کس کے

حساب سے ایک دن کے پروگرام پرتنک لگادی ۔اب پھڈا تو ڈالنا نہیں تھا۔

یہ گائیڈ لوگ بھی بڑے کائیاں ہوتے ہیں ۔ٹورسٹوں کواپنی مرضی سے پٹخنیاں دیتے ہیں۔ پہلے دوڈھائی گھنٹے اُس نے کارپٹ اور ہینڈی کرافٹ کی اُن دوکانوں میں دستی کاریگری دکھانے میں لگائے جن سے یقیناً اُن کا کمیشن طے تھا۔

ترکی قالین یقیناً بے مثال تھے ۔پرسب سے بڑا کمال توسیلزمینوں کی مہارت تھی کس خوبی اور سٹائل سے وہ بھاری بھرکم قالین ہاتھوں میں لہراتے انہیں چکریاں دیتے زمین پرگراتے تھے۔

مجھے بے اختیار وسطی پنجاب کے گاؤں کی وہ الھڑ مٹیاریں یاد آئی تھیں جوگندم کے آٹے کے پیڑوں کومنڈے(پھلکے)بنانے کے لیے ہاتھوں میں لہراتے گھماتے ہوئے اسی دلربایانہ انداز میں توی پر پکنے کے لیے ڈالتی ہیں۔

مٹی سے ظروف سازی اور اس پر تزئین کاری کا عمل بھی ہمارے ہاں کے کمہاروں جیسا ہی تھا۔وہی چاک پر مٹی کے لوتھڑے کوگھمانے اوراُسے شکل دینے کا عمل۔ تاہم یہاں کام میں جدت اورماڈرن ازم تھا۔کمرے میں رکھی گئی نمائشی اشیانے رنگ ونور کی بارش برسار کھی تھی۔

میرے صبر کا پیمانہ اُس وقت لبریز ہوگیا جب ایا صوفیہ کودیکھنے کے لیے صرف آدھ گھنٹہ ملا۔ ایا صوفیہ سے میری جذباتی وابستگی زمانوں سے تھی۔اس کی فینٹسی نے ہمیشہ مجھے مسحور رکھا۔

ساتویں جماعت میں پڑھنے والی وہ لڑکی ہمیشہ میری یادداشتوں میں محفوظ رہی جو اپنی اردو کی کتاب میں ایاصوفیہ کی کہانی پڑھ کراپنی کلاس میں ہی بیٹھی رہی ۔تصویر کودیکھتی اور سرعبدالقادر کا لکھاہوااحوال پڑھتی رہی ۔اورسکول خالی ہوگیا تھا۔وہ لڑکی میں تھی اور

ایا صوفیہ آج میرے سامنے مجسم تھی۔

پُر ہیبت طلسم سے بھری ایا صوفیہ بہت سے ادوار کی کہانیاں سُناتی ہے۔وہ کہانیاں جنہیں سُننے کی مجھے شدید تمنا تھی ۔بازنطینی طرز تعمیر،مشرقی رومن ایمپائر کے دبدبے اور عظمت کی مظہر اس کی فضاؤں میں عثمانی سلاطین کی مذہبی رواداری کی خوشبو ہے۔اس خو شبو کو محسوس کرنے اور سونگھنے کیلئے وقت درکار تھا۔

میں ہجوم سے الگ ہوگئی تھی ۔میرے حسابوں آدھ گھنٹہ تو اُونٹ کے منہ میں زیرے والی بات بھی نہ تھی ۔میں تھی اور ایا صوفیا تھی اور اندر باہر پاکستانی پاکستانی کی سارے میں ڈھنڈیا پڑی تھی ۔گائیڈ مجھے تلاش کرتے کرتے بے حال تھا۔

سیما میرے یوں گواچی گاں کی طرح مُنہ ماری پر تلملا رہی تھی مجھے بھی تپ چڑھی ہوئی تھی ۔اسی لیے میں نے بس میں چڑھنے کے ساتھ ہی گائیڈ کو دیکھتے ہوئے زوردار آواز میں اعلان کر دیا تھا۔

''ہم آپ کا پیکج ہاف ڈے کا کر رہے ہیں۔ہوٹل والوں کو مطلع کر دیجئے۔''

استنبول کی جگہیں ٹھنڈے روح افزا شربت کے وہ گلاس ہیں جنہیں مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے کی ضرورت ہے ۔یہ لوگ تو پورا گلاس سانس لیے بغیر حلق میں انڈیل دینا چاہتے ہیں۔یوں تو اچھو لگ جائیگا۔اپھارہ بھی ہو جائے گا۔

میں نے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔

ہاف ڈے پیکج کا آخری آیٹم گرینڈ بازار کی سیر تھی۔

''چلو اچھا ہے کرنسی بدلوانے کی کوئی صورت تو نکلے گی۔'' میں نے خود سے کہا۔

گرینڈ بازار کے بیرونی دروازے کے ساتھ ہی منی چینج آفس تھا۔میں اور سیما فوراً اسمیں گُھس گئیں ۔جگہ تنگ اور لوگ زیادہ۔میں آخری کونے میں جا کر کھڑی ہوگئی۔

شیشے کی چھوٹی سی دیوار میں بنے قوس نما کٹ میں سے سر کو جھکاتے ہوئے سیٹ پر بیٹھے با ئیس'22' تیئس'23' سالہ خوش شکل سے لڑکے سے میں نے ڈالر اور یورو کا ریٹ پوچھا۔

''1.42 اور 1.82'' جواب ملا۔

''پر یہ تو کم ہے ریٹ تو ۔1.46 اور 1.85 ریٹ ہے۔''

دفعتاً کچھ سوچتے ہوئے اپنایت کے اظہار کے طور پر میں نے پاکستانی ہونے کا بتایا۔لڑکا کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

''پھر تو 1.40 ہونا چاہیے۔''

میں کچھ حیرت زدہ سی ہوئی۔ تُرک پاکستان اور پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔سُنی سنائی اور پڑھی پڑھائی باتوں کے برعکس ہمارا ڈیڑھ دن کا تجربہ اگر بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تو مایوس کن بھی نہ تھا پر یہ تو خاصی دل شکنی والی بات تھی۔

تاہم میں نے سر جھٹکا اور نوٹ گننے لگی جو 1.42 کے حساب سے 284 لیرا ہی تھے۔

گرینڈ بازار الف لیلوی کہانیوں کی طرح تھا۔بیضوی چھتوں کے ساتھ آگے اور دائیں بائیں اطراف سے محراب در محراب پھیلتا، ہلکے زردئی رنگ میں ڈوبا ہوا،جس پر شوخ رنگوں کی نقش و نگاری اُسے بازاروں کی دنیا میں ایک انفرادیت دیتی تھی۔برقی قمقموں کی تیز جگمگاتی روشنیوں میں اسکی سجی ہوئی دوکانیں سیاحوں کے دلوں پر برق بن کر گرتی ہیں۔

284 لیرے جو پرس کی اندرونی جیب میں آسانی سے کھڈے لائن لگ گئے تھے۔دوسو ڈالر کی تو میرے ملک میں نوٹوں کی اچھی خاصی تھدّی بنتی ہے۔بیرون ملک بیشتر پاکستانیوں کی طرح میرے سینے سے بھی لمبی لمبی آہیں نکلتی ہیں۔مقابلوں او رموازنوں میں'' کاش'' کی ہُوک کلیجہ تڑپاتی ہے۔

شاپنگ کبھی میرا کریز نہیں رہا۔ سیما جب دوکانیں جھانکتی تھی ۔ میں شیشے کے چھوٹے سے گلاس میں بغیر دودھ کے کسیلا قہوہ جسے میں نے پانچ چھ چینی کی کیوبز سے میٹھا کر لیا تھا پیتی تھی۔

دوسو چوراسی لیرے چار دن چلے ۔ پانچویں دن توپ کپی سرائے میوزیم کی آرمینیائی طرزِ تعمیر کی خوبصورتیوں اور حرم کی پچی کاری وتزئین کاری کی ہوش رُبا رنگینیوں سے طلسم زدہ سے باہر آئے تو ٹانگیں ٹوٹنے کے قریب تھیں اور کسی بینک کو کھوجنے کی ہمت نہ تھی۔

عام طور پر تُرک انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے ۔ آتی بھی ہو تو غچہ دے جاتے ہیں موہنڈھے مار کر چہرے پر ایسے تاثرات بکھیرتے ہیں کہ بندہ حیران سا ہو جاتا ہے۔ اور اُس وقت (body language) کے استعمال پر میری طبیعت قطعی آمادہ نہ تھی اور گرینڈ بازار سے ملحقہ منی چینج آفس کا لڑکا انگریزی سمجھتا تھا۔

وہیں پہنچے پیارا سا خوش شکل لڑکا دیکھ کر ہنسا ۔ سو ڈالر کا نوٹ سوراخ سے اندر گیا۔ پیسے لیے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل آگئے ۔

ہوٹل کے سامنے رُک کر جب ادائیگی کیلئے میں نے پرس کھولا تو تہہ کیے ہوئے سارے لیرے ہاتھ میں آگئے ۔ میں نے انہیں کھولا ۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہلکے نیلے رنگ کے ایک نوٹ کو چُھونا چاہا تو میں نے بھی اسکا نوٹس لیا ۔ یہ نامانوس سا نوٹ تھا۔ میں نے نوٹوں کو مُٹھی میں بند کر لیا ۔ سیما کو ادائیگی کیلئے کہا اور بدحواس سی دروازہ کھول کر باہر آگئی ۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوا نے میرے اڑتے حواسوں کو ذرا معتدل کیا۔ ہوٹل کے ریسپشن پر کھڑے لڑکے کو نوٹ دکھائے ۔ اس نے نیلے نوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو متروک ہو چکا ہے۔''

میں نے پلکیں جھپکائیں اور یہ سوچنا چاہا کہ کاونٹر پر پیسے لیتے وقت میں نے انہیں دیکھا تھا کیا؟

اور یہ کس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ مجھے اپنی ذہنی سکرین پر اپنے چیسٹ بینک سے سوڈالر کا نوٹ نکالنے کا عمل اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ وہ چھوٹی سی خالی جگہ کیش کاونٹر تک جانے لڑکے کے ہنسنے نوٹ دینے لینے کے سب مراحل متحرک تصویروں کی مانند سامنے تھے۔

پر اگلے منظر پر دبیز دُھند تھی۔

اب بہت سے سوال تھے جو میرے ذہن میں اُبھرے۔ میں نے نوٹوں کو ہاتھ میں پکڑا۔ کیا گنا تھا؟ کیا مجھے اُن میں کوئی خاص چیز نظر آئی؟ لیروں سے تو میں پہلے ہی دن شناسا ہوگئی تھی۔

میری ذہنی سلیٹ صاف تھی اور اُس پر ان میں سے کسی کا جواب نہیں تھا۔ میں گُم سُم سی کھڑی تھی۔ ایک سوتیس لیروں کے ساتھ ہاتھ ہوگیا تھا۔ گویا تقریباً پانچ ہزار پاکستانی روپے کو ٹھُک لگ گیا تھا۔

جاپان اور تائیوان کے سیاح لاونج میں میرے قریب ہی کھڑے اس مسئلہ کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے کسی نے کہا۔ فوراً پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔

’’میں اگر لڑکے کے پاس جاؤں تو‘‘

میں نے ریسپشنسٹ کی رائے لی۔

اُس کا بڑا حتمی جواب تھا۔ ’’یہ زیادہ مناسب ہے پولیس کو رپورٹ کریں۔‘‘

اس استفسار پر کہ پولیس اسٹیشن کہاں ہے؟ تائیوانی نے چھوٹا سا بازو پھیلا کر

لاؤنج کے کونے کی طرف یوں اشارہ دیا جیسے پولیس اسٹیشن تو یہیں کونے میں ہی ڈیرے ڈالے بیٹھا ہو۔

میں بھی حد درجہ احمق اور گھامڑ عورت کہ ساتھ چلنے کی درخواست کر بیٹھی اُس نے تو بھڑ اسا چہرہ فی الفور نفی میں ہلا دیا۔

میں اور سیماب اس نئی مہم پر نکلیں۔پوچھتے پوچھاتے جب جائے مقررہ پہنچیں اس وقت ایا صوفیہ اور جامع (مسجد) سلطان احمد کے نوکیلے مینار زرفشاں کرنوں میں چمک رہے تھے اور دونوں تاریخی جگہوں کے درمیان پارکوں میں ٹورسٹوں کے پرے مست خرام تھے۔

پولیس اسٹیشن میں سناٹا تھا اور ایک بے حد خوبصورت نوجوان ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

سلام کے جواب میں تپاک تھا۔پاکستان کا جان کر لہجے میں محبت کا اظہار تھا۔ میں نے مسئلہ گوش گزار کیا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

''کیا وصولی کی کوئی رسید لی تھی۔''

میں نے ہونقوں کی طرح دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

''جگہ پہچانتی ہیں آدمی کو شناخت کر لیں گی؟''

دونوں سوال ظاہر ہے ایسے تھے کہ میرا جواب جوشیلی قسم کی ''ہاں''میں تھا۔

''گھبرائیے نہیں آپ کے پیسے ضرور آپ کو ملیں گے۔''

پُریقین لہجے سے چھلکتی اُمید کی آس نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔

''مگر''

میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔

''یہ چونکہ criminal case ہے۔آپ کو کریمنل پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ یہ ٹورزم پولیس اسٹیشن ہے۔بیازت یہاں سے زیادہ دور نہیں۔''

اور جب وہ وا کی ٹا کی پر غالباً بیازت والوں کو میرے بارے میں بتا رہا تھا میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ارے میں کون ہوں؟''

اس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ جیسے میں لاہور کے نولکھا پولیس اسٹیشن میں بیٹھی ہوں اور مجھے یہ کہا جارہا ہے کہ محترمہ یہ کیس تو اچھرہ پولیس کا ہے۔وہاں جائیے۔

گاڑی کے لیے معذرت ہوئی۔ٹیکسی منگوا دی گئی اور یہ بھی تاکید ہوئی کہ اسے صرف پانچ لیرے دینے ہیں۔

اُس وقت مجھے پھر اپنی پولیس اس گمان کے ساتھ یاد آئی تھی کہ وہ یقیناً ایک غیر ملکی خاتون کو ٹیکسی میں رولنے کی بجائے گاڑی میں بھیجتی۔

ماشاءاللہ سے ٹیکسی ڈرائیور نے ہیرا پھیری میں پاکستانیوں کو بھی مات کر دیا تھا۔ اللہ جانے کن کن راستوں پر بگٹٹ بھاگا اور میٹر بڑھائے چلا جاتا تھا۔جونہی ایک چوک پر گاڑی رُکی۔''تقسیم'' پر نظر پڑی۔سیما نے بے اختیار اپنے گھٹنے پر دوہتڑ مارا

''ارے دیکھو تو ذرا تقسیم پر لے آیا ہے۔''وہ غصے سے چلائی۔پر اس کا فائدہ۔وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ہماری بکواس کا کچھ اثر نہیں تھا۔اور وہ بڑے مزے میں تھا۔باہر رات تاریک اور بتیاں روشن تھیں۔

تقسیم مرکزی چوک ہے جہاں سے مختلف جگہوں کو راستے نکلتے ہیں۔ہاتھوں میں نقشے پکڑ کر صبح سے شام تک بسوں اور ٹراموں میں خجل خواریوں سے ہمیں شہر کے چہرے مہرے سے خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔

میٹر پچیس لیروں کی نشاندہی کر رہا تھا۔

پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اُس نے سامنے بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا اس وقت 34لیرے روز روشن کی طرح میٹر پر جگمگا رہے تھے۔ہم ٹیکسی سے اُترے۔ پانچ لیرے کا نوٹ میں نے فرنٹ سیٹ پر پھینکا اور رجی داری سے کہا۔

''ہمیں یہی دینے کو کہا گیا تھا۔'' حلق کے اندر سے گھن گرج کے ساتھ آواز نکالی۔

سیما کا ہاتھ پکڑ کر تیر جیسی رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ کو تعاقب میں شور وغوغا تھا۔ للکارتی بھیانک سی آوازیں تھیں۔ اساطیری کہانیوں کی طرح پتھر بننے کا ڈر تو ہرگز نہیں تھا۔ بس جیب کہیں ڈھیلی نہ ہو جائے سارا رولا اِسی کا تھا۔

سیڑھیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں۔ استنبول کا سارا شہر کم بلندی والی ڈھلانی پہاڑیوں پر ایک مربوط اور خوبصورت ترتیبی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔

برآمدوں اور راہداریوں کے چکر کاٹتے ہوئے مطلوبہ جگہ پہنچے۔

اب میری داستانِ امیر حمزہ پھر شروع ہوئی۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ پولیس افسر کے پاس انگریزی کا تھوڑا سا دال دلیہ تھا۔ تفتیشی سوالات ہوئے۔ ماشاءاللہ سے ہاتھ آنکھیں زبان سب چلیں۔ یوں معاملے نے فہم وفراست کی منزلیں بڑی عمدگی اور حد درجہ تعاون سے طے کیں۔

اب خاموشی تھی نتیجے کا اعلان جو ہونا تھا۔

نتیجہ جو سُنایا گیا وہ کچھ یوں تھا کہ چونکہ اب رات کے آٹھ بج رہے ہیں اور آفس بند ہو گیا ہے لہٰذا کل نو بجے تشریف لائیے ہر ممکن مدد کی جائے گی۔

اُترائی کی مشقت اور ٹرام اسٹیشن تک پیدل چلنے کی صعوبت جھیل کر ہوٹل پہنچنے

تک کے وقفے میں مجھے دو تین بار یہ خیال آیا کہ دفع کرو گولی مارو اس قضیے کو۔

سیما کا بھی کہنا تھا ''چل چھوڑ زندگی میں ہزار آئے اور ہزار گئے جان کا صدقہ سمجھ اور دفع دُور کر۔''

لیکن بستر پر لیٹنے اور تھوڑا سا ستا لینے کے بعد میرے اندر کا کہانی کار اور سیاح بھلا چین سے بیٹھتا اور اسے یونہی دفع دُور کر دیتا۔

''ناں جی ناں'' من چلے دل نے کہا۔

بات نکلی ہے تو دُور تلک جائے گی۔

بُرے کو بُرے کے گھر تک پہنچا کے آئے گی۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے بالوں میں کنگھا چلایا۔ جُوتا پہنا۔ رات کے پہنے ہوئے کپڑوں کی سلوٹوں اور شکنوں کو ہاتھوں سے قدرے صاف کیا بیگ کندھے سے لٹکایا اور سیما سے یہ کہتے ہوئے ''جانم میں ذرا پولیس اسٹیشن بھگتا آؤں تب تک تم تیار ہو جانا۔''

سیما پوری بیگم ہے۔ نِک سک سے آراستہ ہوئے بغیر باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

نو بجے جب میں مطلوبہ جگہ پہنچی۔ ماشاءاللہ سے سیٹ پر ایک نیا چہرہ بیٹھا تھا۔ وہ نوجوان لڑکے کسی بات پر اُونچے اُونچے یوں بول رہے تھے۔ جیسے یہ تھانہ تو نہ ہو گلی محلے کی کوئی بیٹھک ہو۔ جہاں کسی بات پر تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی ہے۔

لڑکوں کو بھگتا کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

اب میرا بیان شروع ہوا۔ حفظِ ما تقدم کے طور پر میں نے سب ممکنہ سوالوں کے جواب بھی اس میں شامل کر دیئے کہ فضول کی تفتیشی تکرار سے جان چھٹے۔

داستان گل بکاؤلی سُناتے، خطابت کے جوہر دکھاتے جب فراغت ہوئی۔

فاتحانہ شان کا پرَتو آنکھوں میں لئے جب میں نے اُسے دیکھا میرا جی اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا کہ میں نمّی تو اتنی دیر سے بھینس کے آگے بین بجا رہی تھی۔

وہ چہرے کے بائیں رُخ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹکائے بٹر بٹر میرا منہ دیکھتا تھا۔شدت سے ایک خواہش سینے میں مچلی کہ ایک کرارا سا جھانپڑ اُس کی گدّی پر ماروں ۔تارے دِکھ جائیں دن میں ۔یا پھر اپنے سر کو پھوڑ لوں جو یوں دیوانہ بنا چکریاں کاٹ رہا ہے۔

میں نے مارا ،سر پر نہیں پاؤں پر۔اٹینشن والے انداز میں پاؤں نے فرش بجایا اور گلے سے نکلتی کرخت آواز نے چھت پھاڑی۔

''ہے یہاں کوئی جو میری بات سُنے۔''

فوراً ہی سامنے والے بند دروازوں میں سے ایک دروازہ قدرے زوردار آواز سے کھلا اور ایک لڑکی بھاگنے کے انداز میں میرے سامنے آ کر بہت شُستہ انگریزی میں بولی۔

''بتائیے کیا بات ہے؟''

میری بولتی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔آنکھیں ،ناک ،ہونٹ ،صراحی دار گردن سے نیچے لشکارے مارتا اُس کا قدرے عریاں سینہ ،ننگے سڈول بازو اور سرو جیسا قد میری آنکھوں میں فٹ ایکسرے مشین میں سے ہو کر گزرا۔

''اللہ یہ کمبخت اِس حُسنِ جہاں سوز کے ساتھ پولیس اسٹیشن پر کیا کر رہی ہے؟''

میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

اسے تو توپ کاپی سرائے پیلس یا دولماباشی جیسے محل مینارے میں عثمانی سلطان کے مجید ،حمید ،نذیر کو سک میں جام وسُبو پیش کرتے ہوئے ۔ہونا چاہیے تھا۔

لڑکی پھر بولی۔

''بتایئے کیا مسئلہ ہے؟''

''ٹھہر جاؤ۔مسئلہ تو بعد میں بتاؤں گی۔پہلے تمہارے حُسن کو سراہ تو لوں۔''

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔اور مجھے یوں لگا جیسے بند کلیوں نے چٹک کر اپنے منہ کھول لیے ہوں۔

حُسن کی فسوں خیزی سے نکلی تو اصل مسئلے کی طرف متوجہ ہوئی۔

چلیے جناب۔**کہانی میرے لٹنے کی** پھر دہرائی گئی۔

اُس نے یوں چٹکی بجائی جیسے انگلیوں کی پوروں میں طلسماتی جن مقید ہو۔

''ابھی یہ پولیس مین آپ کے ساتھ جائے گا اور سارا مسئلہ حل کر آئے گا۔ذرا بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے پولیس مین کو دیکھا جو ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور جس کی طرف اشارہ ہوا تھا۔چوچہ سا میرے سکول کے دسویں جماعت میں پڑھنے والے لڑکوں جیسا جن کی مسیں ابھی بھیگتی ہی ہیں کہ وہ جوان دکھنے کے چکر میں گالوں اور ہونٹوں کے بالائی حصوں کو بلیڈ سے چھیل ڈالتے ہیں۔

میں نے بہت لمبی سانس بھری تھی اس میں میری کل شام سے لے کر اب تک کی مشقت کا درد رچا ہوا تھا۔

قہر درویش بر جان درویش اس کے ساتھ چلنے کے سوا کوئی اور چارہ کار تھا کیا؟ سو چلی۔بلڈنگ کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد جب وہ مجھے اُس کھلی جگہ پر لایا جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ مجھے گاڑی میں بٹھائے گا اور گاڑی شور مچاتی، ہوٹر بجاتی، ہٹو ہٹو کرتی، راستہ دو کا عملی مظاہرہ کرتی گرینڈ بازار میں داخل ہو کر منی چینج آفس کے

سامنے رُک گئی۔

''واللہ کس قدر مسرور کُن نظارہ ہوگا۔'' میں نے تصور میں اس منظر سے حظ اُٹھاتے ہوئے آنکھیں نچائیں۔

پر جب بڑا ساپختہ میدان کراس کرنے کے بعد وہ اگلے ڈھلانی راستے پر اُترنے لگا تو بے اختیار میں رُک گئی۔

''گاڑی کدھر ہے؟'' میں نے ہوا میں ہاتھ لہرائے۔

وہ ہونقوں کی طرح میری صُورت دیکھتا تھا۔اور میں اپنے آپ سے کہتی تھی۔

میرے ملک کی پولیس کتنی ہی بدنام سہی پر بے مروت تو ہر گز نہیں۔چٹی چمڑی والوں کے تو آگے پیچھے پھرتی ہے۔

''ہائے ایہہ۔تے وڈی بدلحاظ اے۔''

میں نے اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔اپنے پاؤں کو چھوا اور اشاروں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان میں درد ہے اور چلنا دُشوار ہے۔

اُس نے اشاروں کی اس زبان کو سمجھا اور اچھے بیٹے کی طرح مجھے بازو سے تھام کر چلانا چاہا۔مجھے ہنسی آگئی تھی۔

''چلو میاں چلو''

میں نے خود کو تھپکی دی۔بلاوجہ ہی گاڑی کی آس میں پاؤں بھاری کر لیے تھے۔ بھگاؤ دردوں وردوں کو اور بندوں کی طرح قدم اُٹھاؤ۔

استنبول کے سلطان احمد ایریا کی گلیوں اور چھوٹے چھوٹے بازاروں میں سے گزرتا ہوا وہ ایک جگہ آکر رُک گیا۔

گرینڈ بازار۔اُس نے سامنے بازار کی طرف اشارہ کیا۔

بازار چہرے مہرے سے تو ویسا ہی تھا۔ ”پر“

یہ ُپر ُبڑا اسا سوالیہ نشان تھا۔

اب میں دیدے پٹ پٹ گھماتی ہوں۔بھونچکی سی پچاس گز اِدھر پچاس گز اُدھر دیکھتی ہوں۔نہ وہاں کوئی منی چینج آفس، نہ دوسری سمت خوبصورت مسجد،جس میں ہم نے عصر کی نماز پڑھی تھی۔

میں نے سر کا تو لانفی میں ہلایا۔اشاروں سے منی چینج آفس کی بائیں رُخ پر جائے وقوع کی وضاحت کی اور نور عثمانیہ مسجد دائیں ہاتھ۔خوب اشارے بھی دیئے اور زبان بھی چلائی سمجھانے میں جو جو ہاتھ پلاّ مار سکتی تھی مارا۔چلو خیر کسی نے رہنمائی کی اور پھر چل پڑے۔

ہو بہو گرینڈ بازار جیسے ایک اور بڑی سی سرنگ نما دروازے کے نمودار ہونے پر بھی یہی صورت پیش آئی۔پر اب اُس ُسن وٹے پر انحصار کرنے کی بجائے میں خود بھاگی۔

نورعثمانیہ جامع،نورعثمانیہ جامع (مسجد) کیا بات تھی میری۔کیا ایکٹنگ تھی۔آدھا بازار مجھے دیکھتا تھا۔

پھر کسی نے اُسے سمجھایا۔

ٹانگیں پھر چلیں۔اب جس بازار میں داخلہ ہوا تھوڑا سا ہی چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ ہم صحیح راستے پر ہیں اور جائے وقوعہ بس آنے ہی والی ہے۔

میرا قیافہ درست تھا۔جونہی بازار کا اختتام ہوا نورعثمانیہ مسجد اور منی چینج آفس دونوں نظر آگئے تھے۔میں نے فوراً اُسے بازو سے تھاما۔اندر لے گئی اور لڑکے کی سمت اشارہ کر دیا اور خود کونے میں بنے چھوٹے سے زینے کے دوسرے پوڈے پر کھڑی ہو کر کاروائی کے جائزے میں مصروف ہوگئی۔

ایک عجیب سی بات لڑکے نے صرف ایک چھلچھلتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور چہرہ جھکا لیا۔

اور جب پولیس مین اُس سے بات کرتا تھا۔وہیں کونے سے ایک اونچا لمبا خوش شکل تیس کے ہیر پھیر میں نوجوان شکرے کی طرح اُس پر جھپٹا۔یقیناً وہ آفس کا انچارج ہو گا۔اونچائی پر کھڑے ہونے سے ایک اور بات میرے مشاہدے میں آئی۔اس کی گردن میں صلیبی کراس والی چین تھی۔مجھے تھوڑا سا ذہنی جھٹکا لگا۔یہ عیسائی ہے اور دوسرا لڑکا بھی یقیناً یا عیسائی ہوگا یا یہودی۔

استنبول میں یونانی عیسائیوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ سپین پر کیتھولک عیسائی غلبے کے بعد جب یہودیوں اور مسلمانوں کو دیس نکالا دیا گیا تو عثمانی ترکوں نے کھلے دل سے یہودیوں پر اپنی مملکت کے دروازے وا کیے۔تب سے آج تک وہ یہیں آباد ہیں۔

ذاتی طور پر میں بنی نوع انسان کے بشری تقاضوں، اُس کی فطری کمزوریوں اور بلند ظرفیوں کو مذہبی۔لسانی اور تہذیبی خانوں میں بٹے ہوئے نہیں دیکھتی ہوں۔ہر قوم ہر مذہب ہر فرقے اور ہر گروہ میں اچھے بُرے عناصر ازل سے موجود ہیں اور ابد تک رہیں گے کہ کائنات ہستی کا توازن اسی اصول میں مُضمر ہے۔دھوکہ دہی کے اس کیس میں انہیں اس حوالے سے دیکھنا مناسب ہی نہیں تھا۔

جو بات مجھے اُس لمحے کلِک ہوئی تھی وہ لڑکے کے وہ الفاظ تھے کہ جب میں نے اُسے اپنے پاکستان سے تعلق کا حوالہ دیا تھا۔اسکی طنزیہ ہنسی بھی مجھے یاد آئی تھی۔

تو کیا اُن کے ذہن اُس عالمی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں جو اسلامی، عیسائی اور یہودی دُنیا میں اس وقت جاری ہے؟

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

تھوڑی سی گرما گرمی اور تُوتُو میں میں کے بعد پولیس مین مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔گرینڈ بازار کے باہر ڈیوٹی دیتے وردی والے سپاہی اکٹھے ہو گئے تھے۔انہیں وہ مختصراً کچھ بتا کر سامنے والی دوکان سے مترجم لے کر آیا جس نے مجھے بتایا کہ وہ تو یکسر انکاری ہیں۔

اپنے دفاع میں میں نے دلیل دی کہ میں تین ستمبر کو استنبول میں داخل ہوئی ہوں۔میرے پاس یہ متروک شدہ اتنا بڑا نوٹ کہاں سے آ سکتا ہے۔

یہ بات پولیس مین کو سمجھائی گئی۔وہ پھر اندر گیا میں بھی ساتھ تھی۔اب پھر زوردار گفتگو شروع ہوگئی۔مزے کی بات کہ لڑکے نے اس بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی۔چپ چاپ کھڑا سب دیکھتا تھا۔پولیس مین بے چارہ بھیگی بلی اور وہ ڈبل ٹیریر۔

پھر ہم دونوں باہر آ گئے۔مترجم آیا جس نے مجھے کہا کہ میں پولیس اسٹیشن جا کر تحریری درخواست دوں تا کہ اس پر ایکشن ہو۔

اتنی مشقت بھری خجل خواری کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ہونٹوں اور آنکھوں میں بکھری اس ہنسی میں میں نے بہت دور تک گرینڈ بازار کے نقش و نگار کی شوخیاں دیکھیں۔اور پھر دونوں ہاتھ مترجم کے سامنے جوڑتے ہوئے گویا ہوئی۔

جناب میں کیس کو ڈراپ کرتی ہوں۔استنبول پولیس کی یہ آنیاں اور جانیاں بڑی دل خوش کن ہیں۔اس کی شاندار کارکردگی کو سیلوٹ مارتی ہوں۔جو کچھ جاننے کی خواہش مند تھی وہ جان گئی ہوں اور مزید جان کاری کی ہرگز متمنی نہیں۔ہماری زبان کی ایک کہاوت ہے کہ پنڈ کا پتہ روڑیوں سے لگ جاتا ہے۔

میں نے پولیس مین کے سینے پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''جاؤ بیٹا۔''

اور جب مجمع بکھر گیا پھر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا؟ میں کیوں منی چینج آفس میں چلی گئی۔ اُسی جگہ جا کر کھڑی ہوئی۔ اِس بار دونوں نے مجھے دیکھا پر میں صرف لڑکے سے مخاطب ہوئی۔

تم تو بالکل مجھے اپنے بیٹے جیسے لگے تھے۔ پیارے سے چمکتی آنکھوں والے۔ بوڑھی عورتیں جو مائیں ہوتی ہیں انہیں تو دنیا بھر کے بچے اپنے بچوں جیسے ہی لگتے ہیں۔تو میری جان اُن کے ساتھ ہیرا پھیری نہیں کرتے اور جو کرنے کو دل مچلے تو پھر یہ بانکی سجیلی لڑکیوں کے پرّے کیا کم ہیں اس کام کے لیے۔

اپنی کسی بھی بات کا ردِّعمل دیکھنے کے لیے میں رُکی نہیں تیزی سے باہر آ گئی۔سُورج کی آب و تاب ابھی اپنے جوبن پر نہیں آئی تھی۔بازار کی رونقیں ابھی انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو رہی تھیں۔ملحقہ سڑک پر چلتی میں گرینڈ بازار کے دوسرے دروازے کیپلی کارسی کے سامنے نفیس اور شاندار سے ریسٹورنٹ کے سامنے کمپاؤنڈ میں آ گئی فراخ اور کشادہ کمپاونڈ میں دھری۔کُرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر پُرتکال (مالٹوں) کا جوس گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اپنے آپ سے کہتی تھی۔

چلو اچھی ایکٹویٹی رہی۔ 5200 پاکستانی روپوں میں پڑنے والی یہ کہانی کچھ ایسی بُری بھی نہیں۔

بھید بھری زمین پر۔
بھید بھری کہانی۔

قاہرہ میرے گلے میں اسی طرح پھنس گیا تھا جیسے چھچھوندر سانپ کے گلے میں کہ جسے نہ اُگلے بنے اور نہ نگلے۔

چلو غزہ، اسکارہ اور میمفس اہرام، فراعنہ اور ابوالہول کے مجسموں اور اُنکی لمبی چوڑی ثقیل سی تاریخ کے ساتھ تھوڑے بہت ہضم کیے۔ پر قاہرہ کے وجود پر شریانوں کی طرح پھیلے بازار مسجدیں اور جابجا بکھرے اسلامی تہذیب کے نشاں اُس پر طرّہ قاہرہ قدیم کے محلے گلیاں اُن میں سر اُٹھائے پُرانی عمارات اور اُن سے وابستہ ہر ایک کے ساتھ تاریخی داستانیں ہونکانے اور سانس پھلانے کے لیے بہت کافی تھیں۔

ثنا (میری بھانجی سفری ساتھی) نے اپنے خوبصورت مخروطی ہاتھ منتی کے انداز میں جوڑ کر میری ناک کی پھننگی سے مس کرتے ہوئے دھیمے سے تنبیہی انداز میں کہا۔

''آنٹی خدا کے لیے ہسٹری کے اس پٹارے کو بند کر دیجیے۔حشر ہو گیا ہے۔قاہرہ کی زیر زمین ٹرینوں بسوں ویگنوں اور ٹراموں نے رول دیا ہے۔کروز کا پیکج لیجیے۔نیل کی نیلگوں لہروں پر چند دن کی یہ عیاشی بہت ضروری ہے۔''

گرینڈ پرنسس کا ایک سو نوے ڈالر کا پیکج۔قاہرہ سے لکسر تک ٹرین لکسر سے آگے اسوان تک تین راتیں اور چار دن کا کروز پر قیام۔جابجا قابل دید مقامات پر ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ رنگین اور ہوش ربا پروگراموں کی تفصیل اور تصویروں سے سجا کتابچہ دیکھ کر سوچا۔

''چلو ذرا غریبانہ سے انداز سفر کو شاہانہ رنگ دے کر بھی دیکھتے ہیں۔''

پر یہ کب گمان میں تھا کہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکیں گے۔رات بھر کے سفر کے بعد صبح سویرے پیکج کا گائیڈ ذرا سا ستانے اور نیل کے مشرقی اور مغربی کناروں پر صحرا میں اُگے جنگلی گلاب کی طرح دل کش لکسر Luxor شہر کو جسے الاقصر (محلات کا شہر) اور طیبس (قدیمی نام) بھی کہتے ہیں کو نظر بھر کر دیکھنے کی بجائے قدیم ترین تہذیبی اور ثقافتی ورثوں میں لے جائے گا جنہوں نے دنیا بھر میں مصر کو تاریخی حوالوں سے انتہائی معتبر اور منفرد گردانتے ہوئے اُس پر سیاحت کے ذریعے پیسے کی بارش کر دی ہے کہ ہر ہر قدم پر 50 اور 75 مصری پاؤنڈ کے ٹکٹ جیب سے عشوہ طراز محبوباؤں والا سلوک کرتے ہیں۔لکسر (طیبس) کے نیچے پورا ایک شہر دریافت ہوا ہے۔کھدائیاں جاری اور دنیا بھر سے ٹورسٹوں کے پُرے حاضر اور شہر کا ہر شہری کسی نہ کسی رنگ میں سیاحت کے پیشے سے وابستہ۔

ویلی آف کنگز ویلی آف کیونز۔ویلی آف نوبلز۔ویلی آف ورک مین۔کمبخت مارے شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ویلز کے سلسلے۔سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ میں گاڑی سے نہیں اُتری تھی۔ٹانگیں ٹوٹی پڑی تھیں۔دفعتاً میں نے باہر دیکھا۔صحرا کی

زردئی ریت سے پرے لائم سٹون کے پہاڑوں پر تیز بارشوں اور آندھیوں نے اُن میں جو دراڑیں ڈال رکھی تھیں وہ فرعونوں کی مختلف شکلوں میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔اللہ مصر کی سرزمین تو اُس خوبصورت سیکسی عورت کی طرح ہے جسے فقط مرد کا لمس ہی حاملہ کردے۔

کلوسی آف ممنون رڑے میدان میں کھڑے دیوہیکل بیس میٹر اونچے دو میٹر لمبے پاؤں اور ایک میٹر چوڑائی والے ایمنوفس III کے وہ مجسمے تھے جن کے ٹوٹے پھوٹے لمبی دراڑوں والے خلاؤں کو دیکھ کر خوف سے بھری جھرجھری وجود کو ہلاتی تھی۔ٹانگوں کے ساتھ دو عورتیں بندھی ہیں ایک ماں اور دوسری بیوی۔بیچاری عورتیں۔ماضی بعید ہو ماضی قریب یا حال ہو۔پاؤں اور ٹانگوں کے ساتھ ہی ان کے رشتے ہیں۔یہاں ٹکٹ نہیں تھا۔پر جس انداز میں دھڑا دھڑ کام ہو رہا تھا وہ اس رعایت کے جلد ہی چھننے کا اعلان تھا۔

یہاں ایک اور دلچسپ کہانی سُننے کو ملی کہ صبح سورج کی روشنی کے ساتھ ہی ان مجسموں سے بڑے افسردہ اور غم زدہ گیت فضا میں بکھرتے تھے۔

یونانی شاعروں کو ایسے مواقع اللہ دے۔بھاگے اور ان گیت گانے والے ممنون کے مجسموں کو دیوتاؤں کا درجہ دے دیا۔سیدھی سی بات تو اتنی تھی کہ 27 قبل مسیح میں آنے والے زلزلے نے ان مجسموں کی توڑ پھوڑ کی۔ان میں رات بھر کی ٹھنڈک کے بعد صبح کی پہلی شعاعوں سے پیدا ہونے والی حرارت کی کپکپاہٹ جو ارتعاش پیدا کرتی تھی وہ افسردہ گیتوں کی صورت میں محسوس ہوتا تھا۔

چلو اللہ اللہ خیر صلا۔کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے۔

لنچ کروز پر تھا۔ بہت سی سیڑھیاں اُتر کرنیل کے دہانے پر لنگر انداز The Great Princess کا چہرہ مہرہ رعب داب اور شان و شوکت دیکھ کر مجھ جیسی

ٹٹ پونجی سیاح دم بخود رہ گئی۔ ریسپشن روم سے بالائی حصوں کو چڑھتی چمکتے پیتل کی ریلنگ والی سیڑھیاں بہترین قالینوں سے سجے فرش، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے گورے گوریاں۔

تین جوڑے کپڑوں کے اثاثے پر مشتمل مضبوط سا شاپر میں نے سیڑھی کے دوسرے پوڈے پر ایک جانب بیٹھتے ہوئے اپنے پاس ہی ٹکا لیا۔ دائیں بائیں دھرے صوفوں پر تو چپہ برابر جگہ نہ تھی۔ غباروں کیطرح پُھولے وجود براجمان تھے۔

پاسپورٹ اُن کے پاس تھے۔ معمول کی کاروائی جاری تھی اور پیٹ میں چُوہے بلیاں گُودتی تھیں۔ پراندراج ہونے اور کمرہ کی چابی ملنے سے پہلے ہمارا ڈائننگ ہال میں داخلہ ممنوع تھا۔

میری نظروں کے عین سامنے داخلی دروازہ تھا جس کے ساتھ معلق راستے hanging path پر باہر سے آنے والے جھولتے جھومتے اندر داخل ہوتے تھے۔

دفعتاً جیسے برق سی کوند جائے۔ ایک بےحد دلکش خاتون آنکھوں پر گاگلز لگائے سی گرین چکن شیفون کی شلوار قمیض میں ملبوس داخل ہوئی۔ عقب میں مرد بھی تھا۔ بڑھاپے کے باوجود ایسی جاذب نظر تھی کہ ساتھی مرد کو دیکھنے اور جوڑی کا موازنہ کرنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

انڈین یا پاکستانی۔ میرا ذہن ابھی اسی مخمصے میں تھا، جب ثنا فوری طور پر اپنا اودی رنگا سکرٹ سنبھالتی ہوئی اُٹھی قریب گئی۔ بات چیت کی اور پھر اپنے خوبصورت چہرے پر ہم وطنی کے خوشگوار سے مثبت اثرات بکھیر کر مجھے اُس کے پاکستانی ہونے کا سگنل بھی دے ڈالا۔

پر جونہی اُس نے parada گاگلز اُتار کر ہاتھ میں پکڑی اور ننگی آنکھوں سے

گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف ہوئی۔میرے اندر جیسے بھونچال سا آ گیا۔کہاں دیکھا ہے اِسے؟ یہ دیکھا بھالا چہرہ ہے۔مانوس سا لگتا ہے۔سوالوں کے تو جیسے تابڑ توڑ حملے ہو رہے تھے۔

کاؤنٹر سے چابی لینے کے اشارے پر ثنا نے مجھے اُٹھنے کے لیے کہا۔فسٹ فلور پر مقامی ملبوسات اور سونیرز سے سجی شاپ، پیانو بار اور رنگ سی راہداری رعمیس اول، دوم اور ملکہ نفرتیتی کی تصویروں سے مزین نے مجھے مکمل طور پر متوجہ نہیں کیا۔ذہن میں کھلبلی سی جو مچی ہوئی تھی۔

''مائی گاڈ۔''

دروازہ کھولتے اور بتیاں جلاتے ہی کمرے کی اونچے درجے کی آرائش و زیبائش پر ثنا تو جیسے خوشی سے نہال ہوگئی۔پل جھپکتے ہی اُس نے کھڑکی کے بھاری پردوں کو جھٹک جھٹک کر کناروں پر کیا اور نیل کے پانیوں کو دیکھنے لگی جو کھڑکی سے ذرا ہی نیچے مدھم مدھم سروں میں انگڑائیاں لیتے تھے۔

میں نے بیگ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر دراز ہوگئی۔پیٹ میں بُھوک کی مچی ہا ہا کار بھی کہیں خاتون کے چہرے میں گم تھی۔وہ پچاس کے ہیر پھیر میں نظر آنے کے باوجود حد درجہ سمارٹ اور تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔

ثنا باتھ روم سے فارغ ہو کر اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے حُلیے کو درست کرتے ہوئے کہتی تھی۔

''آنٹی واش روم سے ہو آیئے۔پھر لنچ کے لیے چلیں۔ڈھائی بج رہے ہیں۔''

ڈائننگ ہال میں وہ موجود تھی۔ہم نے پلیٹوں میں کھانا لیا اور اُسی میز کی طرف بڑھیں جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔

مرد عام سے نقوش والا پر دراز قامت تھا اور بے حد سمارٹ بھی۔ سلیقے سے سنوارے گئے گرے بال اُسے سجتے تھے۔

مختصراً تعارف ہوا۔ ایک بہت بڑی بے حد اچھی شہرت کی حامل کیمیکل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھا۔ جرمنی میں ہونے والی کسی نمائش میں شرکت کے بعد مصر سیر سپاٹے کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ وہ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھنے ہی والے تھے جب ہم نے پلیٹیں ٹیبل پر رکھیں۔ کرٹسی کے طور پر تھوڑی دیر کے پھر چلے گئے۔

مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اتنا شاندار کھانا حرام ہو رہا تھا۔ یادداشت پر تو بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں گرفت میں ہوتو کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دوں۔ اپنے بڑھاپے پر غصہ آ رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس وقت جیسے میرے بھیجے میں شدید جھنجھلانے والی خارش نے کھلبلی مچا رکھی تھی۔ جی چاہتا تھا ناک کے نتھنوں میں تیلیاں گھسیڑ کر وہ چھینکیں لوں کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں۔

کمرے میں آ کر میں نے سر تکیے پر رکھا اور ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گاڑھے اندھیرے میں ڈوبا میرا دماغی کمرہ کسی کے کلک کرنے سے روشن ہو گیا ہے۔

عافیہ باجی۔ آواز آئی۔

''وہ کیسے ہو سکتی ہیں؟'' اندر سے سوال اُٹھا۔

ایسی بانکی نار چھیل چھبیلی سی وہ تو مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑی تھیں۔ پر نہیں جیسے میرے وجدان نے کہا تھا کہ تمہیں بوجھنے میں غلطی نہیں ہوئی ہے۔

میں باہر بھاگی۔

ریسپشن پر کھڑے مرد سے میں نے اُس پاکستانی جوڑے کا کمرہ نمبر پوچھا۔ اور پھر 211 پر میرے ہاتھوں نے دستک دی۔

دروازہ کُھلا۔ میں نے آرام میں خلل اندازی کے لیے معذرت کی اور ساتھ ہی سوال اور جواب دونوں داغ دیئے۔

''آپ عافیہ باجی ہیں؟ میں سلمیٰ ہوں خالہ جی کلثوم کی بیٹی اور آپکی دوست فاطمہ کی بھانجی۔''

''ارے تم سلمیٰ ہو۔'' اُس نے فرطِ محبت سے مجھے کھینچ کر اندر کیا اور بازوؤں کے ہالوں میں لپیٹ لیا۔

''ضیا یہ سلمیٰ ہے۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو۔''

مرد لیٹا ہوا تھا۔ ایک خاتون اور وہ بھی بیوی کی شناسا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایلیٹ کلاس سے تعلق کے باوجود اسکے انداز میں جو میرے لیے والہانہ پن تھا میں خوش ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے کی خواہشمند تھی۔ پر میں نے اُس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔

''عافیہ باجی سکون سے بیٹھیں گے۔ کروز پر کافی دن ہیں۔ آپ بھی آرام کیجیے۔ میں بھی بڑی تھکی ہوئی ہوں۔''

اِس کمرے میں اُسے آئے ہوئے کتنی دیر گزری تھی۔ محض دو تین گھنٹے۔ پر اتنے مختصر سے وقت میں بھی ڈریسنگ ٹیبل Dior کے قیمتی کاسمیٹکس اور نینا رچی کے پرفیوم سے سجی ہوئی تھی۔

کمرے سے باہر آ کر میں نے اپنی تھکن زدہ آنکھوں کے پپوٹوں کو دبایا۔ اور اپنے آپ سے پوچھا۔

''میرے اللہ یہ کون سا آبِ حیات پی رہی ہے جس نے اسے ریورس گیئر لگا دیا ہے۔ دولت اگر اس کے پاس ہے تو غریب میں بھی نہیں۔ پھر یہ اتنا فرق کیسے؟''

کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا دو جوڑوں والا میرا غریبانہ سا شاپر میرا منہ چڑاتے ہوئے فرق کی تفصیل مجھے بتا رہا تھا۔

بستر خواہ کتنا ہی آرام دہ کیوں نہ ہوتا اور فطرتاً میں چاہے جتنی مرضی بے نیاز اور لاپرواہ سی ہوتی ۔ کیا میں سو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں ۔

میری سماعتوں میں اُس دس سالہ لڑکی کی چیخیں تھیں جس کی چھوٹی خالہ دوری والا گھوٹنا ہاتھ میں پکڑے جلاّ دہی پوچھتی تھی بولو بتاؤ عافیہ تمہیں لے کر کہاں گئی تھی؟

گالوں پر یقیناً آنسو نہیں تھے۔ پر صُورت جس خوفناک انداز میں سُتی ہوئی تھی اور اس پر جو تاثرات بکھرے ہوئے تھے وہ یقیناً آنسوؤں سے زیادہ خطرناک تھے۔

''نہیں بکو گی تو اس ڈنڈے کو ٹھنے سے ہڈیاں توڑ دوں گی۔'' چھوٹی خالہ کی آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں ۔

''چھوٹی ماسی چھوٹی ماسی۔ میں گھگھیائی ۔ مجھے نہیں پتہ۔''

گھوٹنا میری ٹانگوں پر پڑا اور ساتھ ہی میرے نالوں نے آسمان کو جیسے چُھوا۔

بڑی خالہ اوپر چھت پر بیت الخلا میں تھیں ۔ دہل کر لوٹے سمیت بھاگی بھاگی نیچے آئیں۔

''حد کرتی ہو نمی ۔ بچی کو ذبح کرنا ہے کیا؟''

''یہ بڑی مکار ہے۔ سب جانتی ہے۔'' چھوٹی خالہ نے فتویٰ صادر کر دیا۔

میں بھاگ کر بڑی خالہ کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔

''صفو ماسی۔''

صفو ماسی نے میرا منہ دُھلایا۔ پیار کیا اور مجھ سے واقعے کی تفصیل جانی ۔

''میں تو آنگن میں بیٹھی اپنا ہوم ورک کرتی تھی ۔ عافیہ باجی نے کوٹھے کے جنگلے

سے آواز دے کر اُوپر بُلایا۔اورتھوڑی دیر کے لیے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہماری ڈیوڑھی میں ہی کھڑے ہوکر انہوں نے بُرقعہ پہنا۔پہلی سڑک پار کی، پھر دوسری، اگلے محلے کے ایک گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ اُوپر گئیں ۔وہاں کوئی نہیں تھا۔ برآمدے میں مجھے بٹھا کر وہ خود اندر چلی گئیں۔وہ بُہت دیر اندر رہیں ۔صفو ماسی مجھے تو بہت ڈرلگا تھا۔

میں بھی اول نمبر کی حرامزادی اور مکارلڑکی تھی ۔نی ماسی ٹھیک کہتی تھیں۔ وہ مجھے جانتی تھیں ۔بڑاپکا پیٹھا چہرہ بنا کر میں نے صفو ماسی کی ہمدردی سمیٹی تھی ۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے قطعی ڈر نہیں لگا تھا۔میں تو بڑے مزے سے سارا وقت اُس ایک روپے کے جوڑتوڑ میں پھنسی رہی جو عافیہ باجی نے راستے میں میری ہتھیلی پر رکھا تھا۔ایک روپیہ سولہ آنے والا جس میں چونسٹھ پیسے ہوتے تھے۔قریشی جی (سکول کینٹین والے) کو ایک پیسہ دے کر میں چلانا شروع کرتی ۔

''قریشی جی سنگترہ اور مچھیاں ۔دونوں چیزیں ہاتھوں میں تھام کر میں پھر ہانک لگاتی ۔قریشی جی تھوڑے سے چھولے دے دونا ۔''

چھولے لے کر ایک دو ملوقوں کے لیے بھی منت طرلہ ہوتا ۔

میری روزانہ کی بک بک سے تنگ آ کر ایک دن قریشی جی نے میرا پیسہ گھما کر پھینکا تھا اور غرّا کر بولے تھے ۔

''تم تو دمڑی میں ساری دکان لینا چاہتی ہو۔''

ساری بریک میں روتے روتے میرے آنسو نہیں سوکھتے تھے ۔اب یہاں بیٹھ کر میں نے پکا تہیہ کرلیا تھا کہ ایک اکنی تو قریشی جی کے منہ پر ماروں گی ۔

پھر گھر واپسی کے ساتھ بیان اختتام پذیر ہوا۔صفو خالہ دیر تک چُپ چاپ کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہیں پھر تاسف بھرے لہجے میں چھوٹی خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے

بولیں۔

''بڑا شریف اور مہذب گھرانہ ہے۔اور یہ عافیہ بھی بڑی نیک اور پیاری سی لڑکی ہے پر کس راستے پر چل پڑی ہے یہ۔ بھائی غیر قوم میں رشتہ کیسے کر دیتے؟ بڑی احمق ہے۔ سمجھتی کیوں نہیں؟ ماں ویسے ہی بستر مرگ پر ہے۔''

چند دنوں بعد ہمارے گھر میں گھٹی گھٹی سرگوشیوں پر محلے میں کوٹھوں کے بنیروں تک میں گردش کرتی خبر رقصاں تھی۔

عافیہ اور اس کی چھوٹی بہن دونوں رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ گئی تھیں۔

صفو خالہ نے غم کی اتھاہ گہرائیوں سے ہُوک نکالی۔

''ارے ماں تو جیتے جی مر گئی اور بھائی زندہ درگور ہو گئے۔''

اماں بے کل تھیں کہ کیسے جا کر عافیہ باجی کی امی سے افسوس کریں۔

ہائے نج جو منڈریاں نی جیناں خان نوائے (کاش وہ نہ پیدا ہوں جو خان یعنی بڑوں کو نیچا دکھاتی ہیں)

فہمی خالہ کی تو وہ گہری سہیلی تھی۔ پر فہمی خالہ بڑی ظالم اور بے رحم عورت تھی جس کے ہاں خاندانی وقار اور آن کے مقابل محبت بڑی لغو اور فضول چیز تھی۔

واقعی اُن کی امی چار دن بھی نہ نکالنے پائیں۔ بھائی آئے۔لبوں پر تو پے لگائے گردنیں جُھکائے ماں کے مردہ جسم اور چھوٹی بہن کو پنڈی لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مکان بھی بِک بکا گیا۔

نیند تو ہرگز نہیں تھی۔اونگھ آ گئی تھی کہہ سکتی ہوں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے سُنا۔ نیچے لابی میں ہمارا گائیڈ انتظار میں تھا۔ کرنک اور لگسر ٹمپل دیکھنے جانا تھا۔

شاداش روم سے باہر آئی تو میں نے کہا۔جلدی چلو بھئی۔

ہمارے ساتھ ایک نوجوان ملائی جوڑا مسٹر کول اور مسز لارا کول تھے۔

کرنک کا پہلا منظر ہی ڈراؤنی جادوئی کیفیت اور تاثر کا حامل تھا۔جنگلی گلابوں کی کیاریوں کے عقب میں بھیڑ کے سروں سے مشابہ ابو الہول (Sphinxes) کے پچاسوں مجسمے دورویہ سجے ہوئے تھے۔بلند و بالا سنگی اور کہیں کہیں سے شکستہ دیواروں میں لگے چھوٹے سے آہنی گیٹ سے آگے اِسی ٹائپ کے تین اور انسانی سروں والے Sphinxes کی ایک قطار رنگے آسمان کی چھت تلے شام کے اس جھٹ پٹے میں خوف کی لہروں کو سارے سریر میں ایک سنسنی کی صورت میں بکھیر رہی تھی۔

ہپو سٹائل ہال حقیقتاً مصری طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ان بلند و بالا کالموں اور ستونوں جن پر کھدی انسانی صورتوں کے ایک دوسرے سے مکالموں کی کیفیات اور واقعات دیکھتے ہوئے انسان حیرت زدہ ہو کر بے اختیار سوچتا ہے۔قبل مسیح دور کا انسان کسی بھی طرح اپنے ماحول اور حالات کے مطابق کم ذہین اور فطین نہ تھا۔23 میٹر بلند یہ ستون جنہیں دیکھنے کے لیے گردن کو بہت اُونچا کرنا پڑتا ہے کیسے تعمیر ہوئے؟ دیوہیکل قسم کے پتھر کہاں سے لائے گئے؟ کون سی مٹی گارا چونا مسالا انہیں جوڑنے کے لیے استعمال ہوا جو صدیوں پر محیط بارشوں اور موسم کی سختیوں کے باوجود ابھی تک اُسی آن بان سے کھڑے ہیں۔

مقدس جھیل کے پاس بیٹھ کر میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔فرعونوں کی طاغوتی طاقت قوت اُن کے جاہ و جلال، اُن کی شان و شوکت اور سطوت کے یہ کھنڈر عبرت کے نشان ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ بندے کا پتر بنو۔اور یہ جانو کہ دنیا میں باقی رہ جانے والا سچ صرف وحدت ہے۔

یہ جھیل ایمنوفس III کے زمانے میں مذہبی رہنماؤں کے لیے تھی کہ وہ اپنے روزمرہ

کے فرائض انجام دینے سے قبل اس میں غسل کرتے تھے۔اور دن میں چار بار غسل ہوتا تھا۔ بورڈ پر لکھا یہ سب پڑھ کر مجھے ہنسی آئی ۔بے چارے اسی کام میں لگے رہتے ہوں گے۔

تیرہ سالہ ایک خوبصورت سی لڑکی کیپری پر چھوٹا سا بلاؤز پہنے ایک دیوہیکل پتھر کے پاس کھڑی تھی جس پر کمال کی گھدائی تھی اور جسے فرعون مصر نے کیپری دیوتا کے نام منسوب کیا ہوا تھا۔

باہر گرد وغبار کے بادل تھے ۔کرینیں اور بل ڈوزر مار دھاڑ میں لگے ہوئے تھے۔ کہیں میدان ہموار اور کہیں کھدائی ہو رہی تھی ۔

بہت دور پارک کی گئی گاڑی میں بیٹھی تو عافیہ باجی یاد آئیں ۔انہیں میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔مغرب ہوگئی تھی ۔نماز کے لیے کہاں جاؤں؟ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

''چلو رات کو عشا کے ساتھ پڑھوں گی۔''

کروز پر پہنچ کر گائیڈ اور گاڑی دونوں رُخصت ہوئے۔پر ہمارا تو موڈ سیر سپاٹے پر ابھی مائل تھا۔نیل کے کناروں پر عالیشان بلند وبالا عمارات کی جگمگاتی روشنیوں نے اگر فضا کو بُقعہ نُور بنا رکھا تھا تو نیل کے پانیوں میں بھی ان کے شرارے رقصاں تھے۔

جا بجا چلتی شاندار بگھیاں اور ان کے سائیس شہر کی سیر کی دعوت دیتے تھے بھاؤ تاؤ ہوا اور سات مصری پاؤنڈ میں ہم نے شہر کی سیر کی۔

ڈنر کے لیے ڈائننگ ہال جاتے ہوئے عافیہ باجی سے سیڑھیوں پر ٹکراؤ ہوا۔شام میں وہ کہاں تھیں؟ جیسے میرے استفسار پر انہوں نے لگسر میوزیم کا بتایا۔ساتھ ہی انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سلپ تھما دی۔میں نے نیچے اُتر کر اُسے پڑھا۔لکھا تھا۔

ضیا جلدی سونے کے عادی ہیں ۔دس بجے میں عرشے پر آجاؤں گی تم بھی آجاؤ باتیں کریں گے۔

چور نالوں پنڈ کالی والا حال تھا۔ میں بے اختیار مُسکرا دی۔ مجھے تو جاننے کا اضطراب تھا ہی وہ سنانے اور بتانے کے لیے مجھ سے بھی زیادہ مضطرب تھیں۔چلو یہ بھی اچھا ہوا۔

کھانا کونٹینٹل تھا۔بھوک زوروں پر تھی۔گزشتہ ہفتہ بھر سے اچھے کھانے کے لیے ترسیدہ تھے۔ایسے میں بیشتر لوگوں کے اُٹھ جانے پر بھی ہمارے وہاں ڈیڑھ گھنٹہ تک بیٹھے رہنے کا جواز سمجھ میں آتا تھا۔

لاؤنج بار میں ڈسکو ڈانس تھا۔ثنا وہاں چلی گئی اور میں عرشے پر آ گئی۔کیسا سحر انگیز ساماحول تھا۔گو رات تاریک تھی پر یہ تاریکی بھی بڑی رومانوی قسم کی تھی۔چوبی راستے پر چلتی میں سوئمنگ پول کے پاس ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر نیل کو دیکھنے لگی۔دنیا کا شاید ہی کوئی دریا اس درجہ تاریخ سے بھرا ہوا ہو جیسا یہ ہے۔

دیر بعد میں نے رُخ پھیرا۔انگلش پب اس وقت ویران تھی۔بیسیوں بیچ بیڈز بھی خالی تھے۔دو جوڑے عرشے کی بیک پر صوفوں میں دھنسے سگریٹ نوشی کرنے اور باتوں میں مصروف تھے۔

سوئمنگ پول کے اطراف میں لگے پائپوں سے پانی شرل شرل کرتا اندر گر رہا تھا۔کنارے پر بیٹھ کر میں نے ہاتھ اندر ڈالے۔نیم گرم پانی کس قدر فرحت بخش سا تھا۔

میرا کھیڈن کو مانگے چاند جیسی خواہشوں کا اسیر دل کسی شوخ شرارتی بچے کی طرح پانی میں دھم سے چھلانگ مارنے پر مچل رہا تھا۔پر اواخر مارچ کی یہ رات خنکی سے لبالب بھری ہوئی تھی کپڑوں کی بھی قلت تھی ننگے ہو کر ایسی خواہش کی تکمیل ناممکن تھی۔یوں بھی جوانی والی چستی اور تیزی طرازی کوئی قصہ پارینہ تھی۔پردیس میں بیماری اور بستر میں لیٹنے کی عیاشی سے بھی ڈر لگتا تھا۔اس لیے ایسی بے سروپا خواہش کا گلا گھونٹنا بہت ضروری تھا۔

ابھی جب میں اس ضروری کام سے فارغ ہو رہی تھی۔ سیڑھیوں سے ایک سورج طلوع ہوا۔ اور میری یادداشتوں میں سے ایک منظر اُڑتا ہوا سامنے آ گیا۔ پورے چاند کی رات جب دونوں گھروں کی عورتیں چھتوں کے درمیان حائل پردے کی چار فٹی دیوار کے ساتھ کھڑی باتیں کیا کرتی تھیں ہم بچے بھی بیروں پر چڑھے بیٹھے ہوتے۔ آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتی عافیہ باجی اور انکی چھوٹی بہن سامیہ باجی کو میری نانی جو پنجابی شاعری کی بڑی دلدادہ تھیں نے دیکھتے ہوئے انکی والدہ سے کہا۔

زینب تیری عافیہ کا حُسن تو آفتاب جیسا ہے۔ نگاہوں کو چُندھیاتا اور خیرہ کرتا پر تیری سامیہ ماہتاب جیسی ہے۔ مدھم ملائم ٹھنڈک اور طمانیت سے بھری ہوئی۔ اور اُن کی امی کی ہنسی اور بات مجھے آج بھی یاد تھی۔

''ماں جی دُعا کریں ان کے نصیب بھی سُورج چاند جیسے ہی ہوں۔''

کیبن کی آرام دہ کرسیوں سے جب ہم نے اپنی کمریں چپکالیں۔ عافیہ باجی نے مجھے دیکھا اور کہا۔

''تو میں اب سمجھی ہوں مجھے مصر آنے کی اتنی ہڑک کیوں اُٹھی تھی کہ میری زندگی کا وہ اہم باب جو زمانوں سے بند تھا کھلنے والا ہے۔''

''آپ کے شوہر ضیاء وہی ہیں جن سے ملنے کے لیے آپ مجھے اپنے باڈی گارڈ کے طور پر لے کر گئی تھیں اور واپسی پر مجھے چار چوروں والی مار پڑی تھی۔''

اُن کی ہنسی بھی اُن کی طرح خوبصورت تھی۔ نیل کے پانیوں پر بہت دور تک تیرتی ہوئی گئی۔ ظاہر ہے جس کا ہاتھ پکڑا تھا اُس نے لاج رکھی اور تو ڑنبھایا۔

''بخت ور ہیں آپ۔'' میں نے بس اتنا ہی کہا۔

ایسے منفی اقدام کے بالعموم تلخ نتائج سے متعلق کوئی بات کہنی اُس وقت مجھے

مناسب نہیں لگی تھی۔

تو چلو آؤ وقت کی اُس ٹنل میں چلتے ہیں جہاں جانے کی مجھے ہمیشہ بڑی تمنا ہوتی ہے۔

محلّہ کو پرانے شہر میں ہی شمار ہوتا تھا، پر اُس گھر کی گلی چوڑی اور گھر اپنی بیرونی وضع قطع کھڑکیوں دروازوں کی نسبت سے پوری گلی میں سب سے خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔

نچلی منزل کو کرایے پر اٹھوانے کے فیصلے میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے۔

پینشن اور بڑے لڑکے کی تنخواہ میں حلق تالو گیلا نہیں ہوتا تھا۔ ٹبّر بہت بڑا تو نہ تھا۔ تین لڑکیاں دو لڑکے اور رنچھٹی ماں۔

باپ کو تو افسری برتنی نصیب نہ ہوئی تھی۔ تقسیم کے فوراً بعد کا ایم۔اے پاس۔ مقدر نے اُونچی کُرسی پر بٹھادیا تھا۔ عزت پیسہ رُتبہ چھوٹی عمر میں ہی مل گیا۔

دل کے دورے ابھی اتنے عام کہاں ہوئے تھے۔ جانے کِس منحوس کی نظر اُس کے خوبصورت اونچے لمبے سراپے اور عہدے پر پڑی کہ پتھر پھاڑ نکلی۔ ایک ہی ہلّے میں معاملہ جھٹ پٹ آر پار ہو گیا۔

نجیب الطرفین سے لوگ مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر سے ہجرت کر کے آنے والے۔ ایسی چوٹ پڑی، ایسی قیامت کا مُنہ دیکھا کہ دنوں کیا مہینوں اوندھے منہ پڑے رہے۔ آخر کب تک؟ اٹھنا پڑا۔ ہوش سنبھالنا پڑا۔

بڑا بیٹا پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ اپنے خوابوں کو سمیٹ کر باپ کے دفتر میٹرک کے بعد ملازم ہو گیا۔ زندگی کی گاڑی جُوں تُوں رینگنے لگی۔ باوجودیکہ خاندان مالی بحران کا شکار تھا مگر وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا بھرم رکھنے کی ہر ممکن کوشش ہوتی۔ پھر چھوٹے بیٹے کو بھی سرکاری ملازمت مل گئی۔ گو یہ دوسرے شہر میں تھی پر کچھ بہتری کی آس میں اضافہ تو

ہوا۔

بڑی بیٹی عافیہ کی منگنی ماموں زاد سے ہوچکی تھی ۔ماں تو چھوٹی کے لیے بھی اسی گھر میں متمنی تھیں پر بھاوج ایک نمبر کی شاطر عورت ۔ایک رشتے پر ہی چیں بچیں ۔کجا دوسرا۔ دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔دونوں بیٹے بھی شوہر نے اُن کی کمسنی ہی میں اپنی بہن کی بیٹیوں سے جوڑ دیئے تھے ۔نند بھی تیز طرّار عورت تھی ۔ بھاوج اور نند میں دور پار کی رشتے داری تھی ۔

بہت ساری گھمبیر سوچیں تھیں جو ہمہ وقت خاتونِ خانہ کو گھیرے میں لیے رکھتیں۔کبھی وہ خود سے کہتیں ۔

''اگر عافیہ سامیہ سجاد کے گھر چلی جائیں تو میری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔ بھائی ہے میرا۔اپنا مارے گا تو چھاؤں میں بھی بٹھائے گا۔باقی مقدر میں لکھے گئے دُکھ سکھ تو بھوگنے ہی ہوتے ہیں۔''

دن گرم تھا۔وقت شکر دوپہر کا جب پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہتا ہے۔گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ چھوٹی لڑکی نے بڑے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا۔خاکی پتلون اور سفید قمیض میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔لڑکے کی پیشانی پسینے سے تر تھی جسے وہ اپنے نیلے رنگ کے رومال سے صاف کرتا تھا۔مریم نے اُلٹے پاؤں واپس جا کر ماں کو بتایا۔

''شاید کوئی مکان کے لیے آیا ہو؟''

ماں سوچتے ہوئے اُٹھیں اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئیں۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر ایک قبول شکل لڑکا کھڑا تھا۔سلام دُعا ہوئی ۔خاتون خانہ نے شفقت سے کہا۔

''آؤ بیٹا اندر آؤ۔''

بیٹھک میں چار کرسیاں آنے جانے والوں کے لیے ہی رکھی ہوئی تھیں ماں نے

پنکھا چلا دیا۔ ذرا سکون ہونے پر اس نے آنے کا مدعا بتایا کہ وہ مکان لینا چاہتا ہے۔ کسی نے ان کے گھر کا پتہ بتایا تھا۔ اپنے بارے میں اُس نے تفصیل سے بتایا کہ اس کا نام ضیاء احمد، اُس کے بھائی کا نام عطاء احمد ہے۔ لاہور کی ایک بڑی فیکٹری میں دونوں کیمیکل انجینئر ہیں۔ تنہا ہیں۔ ماں باپ اور بھائی بہن حیدرآباد ہیں، جہاں ان کے باپ کی ملازمت ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ بغور اُسے دیکھتی رہیں۔ لڑکا شریف، گفتگو سے مہذب اور نستعلیق قسم کا لگتا تھا۔

''چلو آؤ پہلے گھر دیکھ لو'' وہ اُٹھیں اور ان کے ساتھ ہی لڑکا بھی کھڑا ہو گیا۔ کمروں میں گھوما، باتھ روم اور کچن کا جائزہ لیا۔ مکان اُسے پسند آیا تھا۔ کرائے کی تفصیلات طے کیں اور ایڈوانس ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔

''ماں جی مکان مجھے پسند ہے ہم جلد ہی شفٹ ہو جائیں گے۔''

وہ بھی خوش ہو گئیں کہ صاف ستھرے لوگ ہیں بڑے خاندان والوں اور چھوٹے بچوں سے وہ بہت گھبراتی تھیں۔ مکان کا ناس مار دیتے ہیں۔

آسودہ سی مسکراہٹ لبوں پر تھی جب وہ اوپر آئیں۔ عافیہ نے کچن میں سے جھانک کر پوچھا۔

''بہت خوش نظر آرہی ہیں امی جان۔''

''ارے ہاں منی اچھے لوگ لگتے ہیں۔''

پر بڑے بیٹے نے شام کو گھر آنے پر نئے نوجوان کرایہ داروں کے بارے میں سُن کر اپنے خدشے اور خفیف سے ڈر کا اظہار ضرور کیا۔

''گھر میں جوان لڑکیاں ہیں امی جان کچھ مناسب نہیں لگتا۔''

پر ماں نے یہ کہتے ہوئے ''ارے نہیں بیٹے بہت بیبا اور شریف لڑکا دِکھتا ہے''
تسلی کر دی۔

ایک ہفتہ گزر گیا پھر ایک دن ٹرک آیا۔ سامان زیادہ تو نہ تھا مگر پھر بھی گھرداری ضرور تھی۔صوفہ سیٹ، پلنگ، تپائیاں، کھانے کی میز اور کرسیاں۔لڑکے غالباً اکیلے رہ کر سلیقہ جان گئے تھے۔انہوں نے آناً فاناً سامان کمروں میں سیٹ کرلیا۔عافیہ سے ماں نے کہا۔

''کھانا زیادہ بنانا۔نیچے بھیجنا ہے۔نئے آئے ہیں۔بیچارے کہاں چولہا جھونکتے پھریں گے؟''

مریم بڑی ٹرے میں کھانا سجا کر لے گئی تو ضیاء نے فوراً اُس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

''گڑیا بھلا اِس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔''

اور گڑیا نے چُپ رہنے کی بجائے جواب دینا ضروری سمجھا۔پٹ سے بولی۔

''تکلیف کیسی ہم نے نہیں کھانا تھا۔''

دونوں بھائیوں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔عطاء نے ٹرے خالی کی اور اس میں ڈھیر سارے آم ڈال کر خوان پوش سے ڈھک دیئے۔تھوڑی دیر بعد جب وہ جانے لگی تو اُسے ٹرے تھمادی۔اس نے کہا بھی۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟ امی جان ناراض ہوں گی۔''

''ارے نہیں ہوں گی۔دیکھو ہم نے کھانا رکھا ہے یا نہیں۔''

مریم جب ٹرے لے کر اوپر آئی۔ماں نے اسے دیکھا تو بولیں۔

''یہ کیوں لائی ہو تم؟''

''امی جان میں کیا کرتی۔انہوں نے زبردستی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔''

حقیقی معنوں میں وہ خاندانی اور باکردار لڑکے ثابت ہوئے۔مہینوں تو ان کی

موجودگی کا پتہ ہی نہ چلا۔ کب اُٹھتے ؟ کب کام پر چلے جاتے؟ رات ڈھلے آتے اور سو جاتے۔ چھٹی کا دن گھر کے اندر ہی گزار دیتے۔ کھانا وہ غالباً باہر کھاتے تھے بس ناشتہ گھر پر کرتے۔

ایک دن عافیہ صبح ناشتہ بنانے کے لیے کچن میں آئی تو نیچے سے آتی ایک نسوانی آواز نے حیران کر دیا۔

''حد ہوگئی ہے۔ کتنی بے ترتیبی ہے تمہارے ہاں۔ ساری زندگی تمہاری ہوسٹلوں میں گزری اور سلیقہ تم میں پھر بھی نہیں۔ تم لوگ تو بڑے ہی پھوہڑ ہو۔ اب بتاؤ! مجھے سویرے چائے کی عادت ہے اور یہاں نہ پتّی کا پتہ چل رہا ہے اور نہ کیتلی کا۔''

عافیہ نے آنگن کے جنگلے سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک خوش پوش سی لڑکی چولہے کے پاس کھڑی برتنوں کی الماری میں چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی اور بولتی جاتی تھی۔ عافیہ خود صبح سویرے چائے پینے کی عادی تھی۔

''اگر پسند کریں تو اوپر آجایئے میں اپنے لیے چائے بنانے والی ہوں۔''

آواز پر لڑکی نے اُوپر دیکھا۔ کیسی حسین اور شاندار لڑکی اُس کے سامنے جنگلے پر ہاتھ رکھے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک حیرت زدہ گُنگ سی اُسے تکتی رہی اور پھر سیڑھیاں چڑھتی اُوپر آگئی۔

چھٹی کا دن تھا گھر کے سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔ وہ ذرا جھجکتی صحن میں آکر رُک گئی۔ عافیہ نے کچن کے دروازے سے نکل کر نرمی سے کہا۔

''رُک کیوں گئی ہو؟ آگے آؤ۔''

وہ کچن میں آگئی۔ اُس نے پیڑھی اُس کی طرف بڑھائی اور کپوں میں چینی ڈالنے لگی۔ دونوں کپ چھوٹی تپائی پر رکھے اور اُسے دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

''چائے کے ساتھ کُچھ لیں گی؟''

''نہیں بس خالی چائے پینے کی بُری عادت پڑگئی ہے۔''

''اضافی عادتیں کبھی کبھی تنگ کرتی ہیں۔''وہ مسکرائی اور کپ لبوں سے لگالیا۔

''چلیے اب تعارف ہو جائے۔'' عافیہ نے چائے کا چھوٹا سا سپ لیتے ہوئے سانولی سلونی لڑکی کو دیکھا۔

''وہ ہنسی۔

''تعارف تو بس دولفظوں کا ہے۔آپ کے کرایہ دار دونوں لڑکوں عطااور رضیا کی چھوٹی بہن نام شہناز تعلیم بی۔ایس سی۔ایم ایس۔سی میں داخلہ نہ لے سکی کہ اماں کو میرے ایڈمیشن والے دنوں میں ہی بیمار پڑنا تھا۔لاہور کی سیر کرنا چاہتی تھی اس لیے اِن کے پاس آئی ہوں۔''

کچھ دیر عافیہ کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر جب نیچے جانے کے لیے اُٹھی تو بولی۔

''اپنے آپ کو روکا تو بہت ہے میں نے کہ پہلی پہلی ملاقات ہے اور اتنی بے تکلفی کا اظہار مناسب نہیں، لیکن کروں کیا؟ کہے بغیر دل نہیں مانتا۔خُدا نے آپ کو کتنی محبت اور فرصت سے بنایا ہے۔''

عافیہ کے لبوں پر بڑی مدھری مسکراہٹ بکھری اور پھر معدُوم ہوگئی۔

کاش ایسی آنکھیں اُس کی سسرال کے پاس ہوتیں۔

دوستانہ تو ہونا ہی تھا۔ہوا اور ہر گذرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ناشتہ نیچے کرنے کی چور ضرور ہوتی۔باقی کھانے اور گلیوں میں بکتی الّم غلّم سب چیزوں کی منہ ماری اُنکے ساتھ کرتی۔

دن بڑے اُداس سے تھے۔خزاں درختوں کے گرتے پتوں میں ہی نہیں موسم کی ہر شے میں اُتری ہوئی تھی ۔دھوپ کے سنہری پن میں جیسے ایک پھیکا پن درآیا تھا۔بگولوں اور آندھیوں کے جھکڑ اِس اُداسی کو اور گہرا کرتے تھے۔

ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن جب عافیہ کی امّی عافیہ کی سُسرال گجرات گئی ہوئی تھیں۔کچھ سُن گُن لینا چاہتی تھیں۔کچھ جاننے کی خواہشمند تھیں۔کیا پروگرام ہے اور کب کا ارادہ ہے؟

شہناز نے دعوت کا اہتمام کرلیا۔

انہوں نے سُنا تو کہا۔

''لو ایک اکیلی تمہاری جان اور ہم تین ۔چھوڑو کس پرا گے میں پڑنے لگی ہو۔''

پر شہناز مُصر کہ ہرگز نہیں ۔روز اُو پر تو کھاتی ہوں۔

''چلو دیکھتے ہیں کیسا پکاتی ہو؟'' عافیہ ہنسی۔

دو بجے اُس نے میز لگادی اور تینوں بہنوں کو آواز دی ۔مریم سکول سے آچکی تھی۔ تینوں نیچے اُتر گئیں ۔کھانے کی میز پر بیٹھیں تو سامیہ نے سلیقے سے سجی میز کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی رنگ رُوپ تو زبردست ہے۔''

شہناز نے دعائیہ انداز میں کہا۔

''اللہ کرے اب سوادی بھی ہو۔''اُس نے ''سوادی'' کو جس انداز میں کہا۔تینوں بڑی محظوظ ہوئیں۔

کھانا ابھی شروع ہی کیا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلا دونوں بھائی اندر آئے ۔

شہناز نے حیرت سے اُنہیں دیکھا اور پوچھا۔

''آپ لوگ کیسے؟''

''فیکٹری میں ہڑتال ہوگئی ہے۔''

اب صورت یہ تھی کہ دونوں بھائی شرمندہ شرمندہ سے دوسرے کمرے میں تھے۔شہناز بوکھلائی ہوئی اور خود اُن دونوں بہنوں کے تُقمے ان کے ہاتھوں میں۔شہناز نے آہستہ سے ان کے پاس آ کر کہا۔

''اگر آپ بُرا محسوس نہ کریں تو بھیا لوگ بھی ساتھ بیٹھ جائیں۔''

عافیہ تو ابھی تذبذب میں تھی پر سامیہ متانت سے بولی۔

''ہاں ہاں کوئی حرج نہیں۔پر دیکھو ڈیوڑھی کے دروازے کو کنڈی لگا آؤ۔''

شہناز دونوں بھائیوں کو لے آئی۔ضیاء اور عطاء نے حُسن وخوبصورتی کے ان مجسموں کو پہلی بار دیکھا تھا۔کبھی ٹکراؤ ہی نہیں ہوا تھا۔دنگ رہ گئے تھے۔اُن کے آجانے سے ماحول پر گھمبیر سی خاموشی چھا گئی البتہ مریم دونوں بھائیوں سے خاصی بے تکلف تھی وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ارے کچھ بات کیجیے نا۔سب خاموش ہو گئے ہیں مجھے خاموشی اچھی نہیں لگتی۔''

اُس کی معصومانہ سی بات پر سبھی مُسکرا پڑے۔ضیاء نے دھیرے سے نگاہیں اُٹھا کر عافیہ کو دیکھا اور کچھ سوال جواب کیئے۔اُس کی تعلیم اور مشاغل کے متعلق پُوچھا۔

بڑا مختصر سا جواب تھا۔کہ میٹرک کے بعد بی۔اے تک کی تعلیم تو ساری گھر پر ہی ہوئی۔

اور یہ سوال کہ ایم۔اے کیوں نہیں کرتیں۔

اُس نے سادگی سے کہہ کر بات ختم کر دی۔شاید ایم اے مُشکل ہے۔یا پھر یہ کرنا مجھے مُشکل لگا۔

ماحول میں تھوڑی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔عطا نے بھی سامیہ کے ساتھ ہلکی پُھلکی باتیں کیں۔

تینوں بہنیں جب کھانا کھا کر جانے کے لیے اُٹھیں تو ضیاء اور عطا نے دونوں کو جس والہانہ انداز سے دیکھا اُس نے دونوں بہنوں کے سر جُھکا دیئے۔اوپر آکر انہوں نے مریم کو منع کر دیا کہ وہ کسی کو نیچے کھانا کھانے کے بارے میں نہ بتائے۔

وہاں تو وہی بات ہوئی تھی کہ دیکھا اور دل میں اُتر گئیں۔شام تک وہ پلنگوں پر لیٹے سگریٹ پیتے اور دھوئیں کے مرغولوں میں اُن کے پیکر دیکھتے رہے۔شہناز نے ضیاء سے شاکی انداز میں کہا۔

''بھیا اب آپ مجھے کہیں سیر کے لیے بھی لے کر جائیں گے یا یوں ہی گھر کے اندر رکھ کر ایک دن حیدر آباد کی گاڑی چڑھا دیں گے۔''

دونوں سُلجھے ہوئے ،متین اور رُردبار سے نوجوان تھے وگرنہ ضیاء کا دل تو چاہا تھا کہ وہ کہے ''بھئی جتنی سیریں کہو کروا دیتے ہیں۔پر اُسے ساتھ لے لو جو عافیہ ہے۔''

پر یہ تو دل نے کہا تھا اور دل کی بات ہونٹوں پر لانا اُس جیسے نوجوان کے لئے کہیں ممکن تھا۔

ماضی کے دُھندلکوں میں گُم کہانی سُننے اور سُنانے کا عمل اس درجہ محویت سے جاری تھا کہ پتہ ہی نہیں چلا کب کوئی آیا۔

بس اِن لفظوں نے ماحول کے طلسم کو توڑا۔ضیاء اپنی دراز قامتی کے ساتھ خفیف سے جُھکے اپنی بیوی سے کہتے تھے۔

''عافی رات کا ایک بج رہا ہے۔میری آنکھ کھل گئی تھی۔کوشش بسیار کے باوجود نیند نہیں آئی۔آؤ چلو باقی باتیں کل پر رکھنا۔''

عافیہ باجی کس سرعت سے اُٹھی تھیں۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ اس وقت بلسیر ڈروم اور لاؤنج بار کبھی جگہ سناٹا تھا۔

بستر پر لیٹ کر بھی مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ سرہانے لگی روشنی نے اُکسایا کہ لکسر پر لٹریچر ہی پڑھ لوں۔ پڑھتے ہوئے بے اختیار ہی اس شہر کے مقدر پر رشک آیا جس کے قریب ہی چھوٹے سے گاؤں اطوڈ میں خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ نے جنم لیا تھا۔

اب پتہ نہیں کب سوئی پر خوابوں میں بھی اطود میں ہی گھومتی پھری۔ سویرے ہی جاگ گئی۔ اوپر بھاگی کہ طلوع آفتاب کا نظارہ کروں۔ مجھے تو یہاں ایک اور کنفیوژن سے پالا پڑا تھا۔ کہ کعبہ کا تعین غروب آفتاب کی سمت سے نہیں طلوع آفتاب کی سمت سے ہوتا ہے۔ ادھر کہ اُدھر اِنہی چکروں نے اُلجھائے رکھا اور پھر سامنے نیل کے پار کی پستہ قامت پہاڑیوں کے اوپری سرے کرنوں میں نہائے نظر آئے تو سخت مایوسی ہوئی۔

ناشتہ کرنے تک میں اپنے آپ سے یہی سوال کرتی رہی۔ اگر میں اطود چلی جاؤں تو ساڑھے دس کروز کی روانگی تک واپسی ہو سکتی ہے۔ اب جواب عجیب گھمن گھیری میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی نیل کے کنارے رعمیس دوم کا وہ محل تھا جہاں حضرت موسیٰ کی پرورش ہوئی۔ وہ چھوٹی سی لڑکی بھی میرے تصور میں تھی جو اپنے بھائی کے پانی پر بہتے صندوق کے ساتھ ساتھ کتنی دور تک دوڑتی چلی گئی تھی۔

''میرے مولا اس نیل کو بھی تو نے کتنی فضیلتوں سے نوازا ہے۔ کہیں اس نے پیغمبر کا بارِ امانت اُٹھایا کہیں تاریخ اسلام کی عظیم ہستی عمر نے اسے مخاطب کیا۔''

اور میں اوپرے دل سے لکسر کی گلیوں بازاروں میں گھومتی پھرتی تھی۔

ساڑھے دس کی بجائے کروز نے ساڑھے گیارہ بجے حرکت کی۔ وقت کی اس زیادتی نے اور میرے دل کو جلایا۔ ہم دھیرے دھیرے لُکسر کی بلند و بالا عمارت سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ عرشے پر اس وقت مسافروں کا رش تھا۔ دھوپ بھی تیز تھی اور ہوائیں بھی ٹھنڈی تھیں۔ سوئمنگ پول کے گرد رنگین Bikni کے دھنک رنگ بکھر گئے تھے۔ تھل تھل کرتے مرد و زن کے نیم عریاں اجسام عجیب سی کراہت کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

رفتار تیز ہو گئی تھی۔ کو نیل کے دونوں کناروں پر مناظر کی خوب صورتیاں گرفت میں لینے والی فسوں خیزیوں جیسی تو نہ تھیں جہاں بندہ بے اختیار بول اُٹھے کہ دامنِ دل می کشد کہ فردوس ایں جا است۔

تاہم اپنے تمام تر تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے ہمراہ زردئی پہاڑیوں گنے اور کیلے کے کھیتوں کچے پکے مکانوں سیاہی مائل سبز پانیوں کے ساتھ ایک خوبصورت اور دلکش تاثر کے نمائندہ تھے۔

پر ان منظروں کا حُسن دو چند ہوا جب تیز دھوپ کی کوکھ سے شام نکل کر فضا میں پھیلی۔ کھجوروں کے درختوں کے نوکیلے پتوں کی تیز ہوا کے بلّھوں سے اسی طرح مانگوں نے لشکارے مارے جیسے جوان لڑکیوں کے بالوں سے لمبی لکیریں اشارے کرتی ہیں۔

عرشے پر چائے کے اہتمام نے شام کی رنگینی اور بڑھا دی۔ مغرب نے ایک اور انوکھا منظر دکھایا۔ کروز Esna سے ٹرن لے رہا تھا اور بے شمار کشتیوں نے اُس کا گھیراؤ اسی انداز میں کیا جیسے پولیس کسی مشتبہ گھر کو چاروں جانب سے گھیرے میں لے لے۔ پلاسٹک کے شاپروں میں رکھی شالیں کشتی والے گیند کی طرح اُچھالتے ہوئے عرشے پر کھڑے لوگوں کی طرف پھینکتے۔ بھاؤ تاؤ کے لیے خوب خوب بولا جاتا۔ نہیں، ہاں ہاں کی تکرار ہوتی۔ کچھ شاپر واپس بھیجے جاتے کچھ پانی میں گرتے۔ کشتیاں انہیں پکڑنے کے لیے تیزی

سے حرکت کرتیں۔ واہ کیا انداز تھا شاپنگ کا۔ انوکھا اور نرالا۔ ضرورت ایجاد کی ماں شاید اسی کو کہتے ہیں۔

میرے پاس کھڑی خاتون فوٹو کاپی کیے چند کاغذات ہاتھوں میں پکڑے ان کے مطالعے میں محو تھی میں نے نظریں دوڑائیں۔ ایسنا کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ کبھی یہ بالائی مصر کا کیپٹل سٹی تھا ماضی میں Latopolis کے نام سے شہرت رکھتا تھا اور یہ نام اسے یونانیوں نے مقدس مچھلی لیٹو کے نام پر دیا تھا۔ اسکے موجودہ گاؤں میں یہاں صرف ایک ہی ٹمپل خونم دیوتا کے نام سے موسوم موجود ہے۔

رات کے کھانے پر سموک ویل (فرائی مچھلی) گوشت اور چکن تھا۔ چاولوں سے سجی قاب یوں دکھتی تھی جیسے برتن سچے موتیوں سے بھرا ہو۔ چھ اقسام کے میٹھے اسپر طرہ کھانے کے فوراً بعد پریزنٹیشن کا کٹیل کا شور رہا۔ لاؤنج میں عملہ ایک کے بعد ایک تالیوں اور مدھم سی موسیقی کے شور پر بھاگا بھاگا آتا اور سامنے کھڑا ہو جاتا۔ ایک خوبصورت سا نوجوان گلا پھاڑتی آواز میں غالباً تعارفی جملے بولتا تھا۔ ہمارے تو سر سے الفاظ گزر رہے تھے۔ چھت سے منعکس رنگارنگ روشنیوں کے جلو میں سوفٹ ڈرنک اور کیک پیش کیا گیا۔

میں جب عرشے پر آئی تو خنک اور لطیف ہواؤں میں تاروں بھرے ٹمٹماتے آسمان کی چھت اور روشنیوں سے جگمگاتے زمین کے آنگن خوبصورت منظروں کے عکاس تھے۔ مجھے ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ عافیہ باجی آئیں اور ہم پھر کہانی میں ڈوبے۔

لیکن جب دونوں بھائی دفتر میں اکٹھے بیٹھے تو وہ بات دونوں کے لبوں پر آ گئی جو وہ رات اور دوپہر سے ایک دوسرے سے کہہ نہ پائے تھے۔

''دو ماہ رہتے ہو گئے ہیں اس گھر میں۔ یہ چاند اور سورج کہاں چھپے ہوئے

تھے؟''

عطا نے کہا ''یار کیسا نرم ٹھنڈا اور دلکش حسن تھا اُس سامیہ کا۔''

اور یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ عافیہ کی امی گجرات سے بڑی بجھی بجھی سی آئیں۔ بہت سارے لنگڑے لُولے بہانے سُننے کو ملے تھے۔

''لڑکا تو ابھی نیا نیا نوکر ہوا ہے کچھ سیٹ تو ہونے دیں اُسے اور ہاں تمہارے لڑکے بڑے ہیں پہلے اُن سے تو نپٹو۔ تمہاری نند بھی جوان لڑکیاں لیے بیٹھی ہے۔''

اب انہوں نے کہا بھی میں بیوہ عورت ہوں۔ بہوؤں کے آنے سے پہلے بیٹیوں کو وداع کرنا چاہتی ہوں۔

پر کمزور کی بات ہمیشہ سے بے وزن ہلکی اور بے قعت ہے۔ یہی اُن کے ساتھ بھی تھا۔

اُن کے خاموش اور گہرے تفکر کو بیٹی نے سمجھا اور پوچھا تو عجیب سے یاس بھرے لہجے میں دُکھ سے بولیں۔

''آثار اچھے نہیں لگتے۔ کھل کر او روو بدو انکار تو نہیں کیا پر نوشتہ دیوار صاف ہے اور میں اُسے پڑھ آئی ہوں۔''

وہ صبر ایوب کی قائل تھیں۔ جانے کتنا دُکھ اندر سمیٹے بیٹھی تھیں پر اُس دن بے اختیار ہی پھٹ پڑیں۔

''بیٹے تو ابھی سے پھوپھی کی زبان بولتے ہیں۔ جب بیویاں آگئیں تو بات کرنے سے بھی جائیں گے۔ رشتوں کا ویسے کال پڑا ہوا ہے۔ ہوشیار چالاک میں ہوں نہیں۔ لوگوں سے بھی کچھ میل ملاقات نہیں۔

سوچتی تھی۔ تمہاری شادی ہو جائے تو شاید سامیہ کے لیے بھی راہ نکل آئے۔

بھائی کے دل میں کوئی رحم کا احساس جاگ جائے ۔ پر میں ہی احمق تھی ریت سے مکان بنانے بیٹھ گئی ۔''

عافیہ نے اپنے دل میں اُمنڈتے اُس طوفان پر کیسے کیسے بند لگائے جو آنسوؤں کی صورت باہر لپکنے کو بے تاب تھے یہ صرف وہی جانتی تھی ۔ پر اپنی ماں کے اندر اُمنڈتے طوفان کا تو وہ اندازہ ہی نہ لگا سکی ۔ کیسا خوفناک دباؤ تھا ۔ دل پر کتنی گھٹن تھی جو نصف شب کے قریب پھٹ کر دورے کی صورت باہر نکل آئی ۔ ماں کا پیلا پھٹک پسینے سے تر بتر چہرہ اور اسکی ابتر حالت نے اُنہیں چیخنے چلانے پر مجبور کر دیا کہ گھر میں تینوں لڑکیاں ہی تھیں ۔ بڑا بیٹا تو پنڈی ٹرانسفر ہو گیا تھا چھوٹا بیٹا سہالہ میں تھا ۔

آہ و بکا کی آوازیں سن کر شہناز اور عطا ضیا بھی گھبرا کر اُوپر بھاگے ۔ دونوں بھائی اندر آئے ۔ دیکھا ۔ ایک نے دوسرے کو فوراً فیکٹری فون کرنے اور گاڑی لانے کے لیے کہا ۔ کوئی پون گھنٹے میں گاڑی آ گئی ۔ دونوں بڑی بیٹیوں کی جان مٹھی میں آئی ہوئی تھی چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ ننگے پاؤں ہی ماں کے ساتھ چل دیں ۔ جب ضیا نے دھیرے سے عافیہ کو شانوں سے تھام کر پیچھے کیا ۔

''خدا پر توکل رکھیں کمرے میں جا کر دوپٹہ بدلیں اور چپل پہنیں ۔''

شہناز نے دونوں بہنوں کے چپل اُن کے پاؤں میں ڈالے ۔ چادریں دیں اور پھر وہ گاڑی میں ماں کے دائیں بائیں بیٹھیں ۔ ضیا اور عطا ڈرائیور کے ساتھ جڑ گئے ۔

ایمرجنسی میں داخلہ ہو گیا ۔ فوری طبی امداد دی گئی ۔ ساری رات دونوں بھائیوں کی بھاگتے دوڑتے ۔

میڈیکل سٹور سے دوائیں لاتے ، اِدھر اُدھر جاتے گزری ۔ دونوں بہنوں کی رو رو کر آنکھیں سوجھ گئی تھیں ۔ کبھی عطا انہیں تسلی دیتا اور کبھی ضیا ۔ صبح پو پھٹی تو عافیہ نے ضیا سے

کہا۔

''آپ میں سے ایک گھر چلا جائے مریم تنہا ہے اور بڑے بھیا کو فون بھی کر دیں۔''

اُس کے جواب میں ضیا نے کہا۔عطا گھر کا چکر لگا آیا ہے تسلی بھی دے آیا ہے۔ میرے خیال میں بڑے بھیا کو فون کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ وہ یہاں آ کر کیا کریں گے۔بس اللہ سے دعا کریں۔اِن کی حالت ذرا سنبھل جائے تو اُنہیں اطلاع کر دیں گے۔

عطا اُس وقت باہر تھا۔وہ اندر آیا تو اُس کے ہاتھ میں تھرماس اور ٹوکری تھی۔اس نے ٹوکری میں سے کپ نکالے۔چائے اُن میں انڈیلی پیکٹ میں سے چند بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور کپ اُن کی طرف بڑھائے۔

عافیہ نے دُکھ بے بسی اور شرمندگی کے جذبات سے لبالب بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

ضیا نے کپ اُسے تھمایا اور صرف اتنا کہا۔

''پریشانیوں کا مقابلہ ہمت اور حوصلے سے کرتے ہیں۔انسان دل ہار بیٹھے تو

بات

نہیں بنتی۔''

پہلی بار اس سارے وقت میں سامیہ نے آنکھیں اُٹھا کر عطا کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل گرفتہ آواز میں بولی۔

''آپ ہمارے لیے کس قدر تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔''

''آپ چائے لیجیے۔غیروں والی باتیں مت کریں۔''

عافیہ کو شہباز سے کبھی کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا۔وہ اُس کی منگیتر ضرور تھی مگر منگیتر بنانے

میں اُس کی ماں کا ہاتھ تھا۔ وہ چھوٹی سی تھی جب ایک بار اُس کا ماموں اور ممانی ان کے گھر آئے۔ ممانی نے اِس من موہنی صورت کو حیرت سے دیکھا اور بے اختیار بولی۔

''با نو تمہاری یہ بیٹی تو شہزادی دِکھتی ہے۔''

اور ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پیاری لگتی ہے تو تم لے لو نا۔''

یوں ماں نے کئی دفعہ کہہ سُن کر منگنی کروائی۔ عافیہ جب بڑی ہوئی اور اُسے یہ سب معلوم ہوا تو وہ بہت جز بز ہوئی۔ ماں نے رسان سے سمجھایا۔

''پاگل ہو بیٹی۔ باپ سر پر نہیں۔ بھائی کونسا اتنے بڑے اور سمجھدار ہیں۔ میں کہاں رشتے ڈھونڈتی پھروں گی۔ یہ اپنے تو ہیں نا۔''

دونوں بہنوں کو ممانی ناپسند تھی۔ ماموں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ شدید قسم کا زن مرید۔ بہن پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے پر مجال ہے جو کبھی انہوں نے ایک پیسہ بھی خرچ کیا ہو۔

ایک ہفتہ ہسپتال والوں نے ماں کو خصوصی دیکھ بھال کے وارڈ میں رکھا۔ یہ سب ضیا اور عطا کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ دو ڈاکٹر تو ان کے ایف ایس سی کے کلاس فیلو نکل آئے تھے۔

دونوں بہنوں کو انہوں نے اُسی دن گھر بھیج دیا یہ کہتے ہوئے کہ ہم کافی ہیں۔

وہ بس ملاقات کے وقت آتیں۔ تیسرے دن مکمل ہوش آ گیا تھا۔ ضیا ہی ان کے پاس تھا جو اُن پر جُھکا طبیعت کا پوچھ رہا تھا۔ جواب دینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

سچ تو یہ تھا کہ دلوں کے فاصلے جنہیں شریف گھروں کی نیک بخت لڑکیاں سالوں

مہینوں میں طے کرتی ہیں وہ دونوں بھائیوں کے ایثار اور قربانی نے دنوں میں طے کروا دیئے تھے۔دونوں ضیا اور عطا کے لیے بہت لطیف جذبات محسوس کرنے لگی تھیں۔

اب ماں کافی بہتر تھیں۔بیٹھ کر جوس پیتی تھیں۔بیٹیاں آتیں تو ان سے باتیں کرتیں۔دو تین دنوں میں ہسپتال سے بھی ڈسچارج ہونے والی تھیں۔عافیہ اُس دن ضیا کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔عطا ڈیوٹی پر تھا۔ماں سو رہی تھیں۔اُس نے ٹفن بکس بیچ پر رکھا اور ضیا سے مخاطب ہوئی۔

''آپ کھانا کھالیں۔''

اُس کی اس بات کا جواب دینے کی بجائے ضیا نے اُسے دیکھا اور کہا۔

''عافیہ مجھے اِن دنوں پر خواب کا سا گمان گزرتا ہے۔میں تمہیں پسند ہی نہیں چاہنے لگا ہوں۔پر ڈرتا ہوں تمہارے میرے درمیان زبان اور معاشرت کی اونچی دیواریں حائل ہیں۔میرے گھروالوں کو تو پنجابی گھرانے میں شادی پر اعتراض نہیں ہے مگر تمہارے گھر والے مجھے اور عطا کو قبول نہیں کریں گے۔خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ تم کسی سے منسوب بھی ہو۔''

لہجے میں یاس گھل گیا تھا۔آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جب وہ بولی۔

''منسوب ہونے کی تو ایک تہمت ہی ہے۔نہ وہ لوگ میری چاہتوں میں کہیں ہیں اور نہ ہی میں اُن کی۔جیسے کوئی زبردستی گلے مڑھ دیا جائے۔بس یہاں بھی وہی بات ہے۔''

چھوڑیئے ان باتوں کو۔کھانا کھائیں۔''اُس نے دیکھا تھا لقمہ ضرور ضیا کے ہاتھ میں تھا مگر اُس نے اسے منہ میں نہیں ڈالا تھا۔

کہنے کو تو اُس نے ضیا سے کہا تھا مگر خود وہ اور سامیہ انہی سوچوں سے نڈھال

تھیں ۔سامیہ نے ابھی کل شام ہی کہا تھا۔

''ہم کیسے لوگ ہیں۔کہیں زبان، کہیں مسلک، کہیں عقیدے، کہیں معاشرت، کہیں علاقائی حد بندیوں کی زنجیروں میں جکڑے خود کو افضل و اعلیٰ سمجھے بیٹھے ہیں ۔اچھے انسان کتنے نایاب ہیں؟بڑے بخت ور ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی کی راہوں پر کہیں ایسے من موہنے لوگ مل جائیں۔مگر یہ ہماری کتنی بدنصیبی ہوگی کہ جھوٹی اَنا اور دُنیا کی باتوں کے پیچھے اُن سے ناطہ توڑ لیں ۔عافیہ سچی بات ہے میں تو عطا کے لیے جوگ لے لوں گی پر کسی دوسرے سے بیاہ نہیں کروں گی۔''

عافیہ کچھ نہیں بولی تھی ۔بولتی بھی کیا؟ سامیہ ٹھیک کہتی تھی انسانوں نے کیسے اپنے آپ کو لسانی گروہوں، ذات پات کے قبیلوں ،فضول رواجوں خودساختہ اصولوں اور رسُوم کے تکلیف دہ شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے ۔انسانیت کو کون دیکھتا ہے، مذہب اِن سب کا انکاری ہے اِس کی پرواہ کسے ہے؟ کون دلیر اور جری ہے جو ان کے خلاف آواز اُٹھائے ان زنجیروں کو کاٹے۔ یہاں تو کچے کانوں والے بھائی اور کمزور دبو قسم کی پردہ نشین صلح جو قسم کی ماں جو رشتہ داروں سے حد درجہ خائف اور اس پریشانی میں ہمہ وقت مبتلا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے کہ خاندان کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ:

''دیکھا نا باپ سر پر نہیں تھا۔بن باپ کی بیٹیاں ایسے ہی گُل کھلاتی ہیں۔''

اب ایسے میں عافیہ ٹھنڈی سانس ہی بھر سکتی تھی۔

پر دل پر کسی کا اختیار نہیں تھا۔وہ تو اُسے البیلے خواب دکھانے لگا تھا اور وہ تاریک راتوں میں یہ خواب دیکھتی بھی تھی یہ اور بات ہے کہ صبح کی روشنی میں آنکھیں مسلتی تو خواب بھی مسل دیتی۔

سامیہ اس معاملے میں زیادہ جذباتی واقع ہوئی تھی۔اس شام جب شہناز مریم

کے ساتھ بڑے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تھی دونوں غالبًا باتیں کرتے کرتے سوگئی تھیں جب عطا نے نیچے سے آواز دی۔ سامیہ نے جنگلے سے جھانک کر دیکھا اور پُوچھا۔

''کچھ کام تھا۔''

اُس نے آنکھیں اُوپر اٹھائیں۔ چند لمحے اُسے دیکھتا رہا۔

پھر بولا۔

''ہاں چائے کا ایک کپ پینا چاہتا تھا۔'' اِس وقت خود بنانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔

''میں لاتی ہوں۔'' کہتے ہوئے سامیہ چائے بنانے چلی گئی۔

چائے دانی میں چائے ڈال کر اور اُسے ٹی کوزی سے ڈھانپ کر وہ بڑے خود ہی نیچے لے گئی۔ کپ میں چائے ڈال کر جب اس نے عطا کو دی تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا سامیہ کو ہنسی آ گئی۔ کچھ جھینپ بھی گئی۔

''چائے لیجیے۔ کپڑوں پر گر جائے گی۔ میرا کیا ہے؟ مجھے تو فرصت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

عطا اس بات پر ہنس پڑا۔

''ارے کہاں؟ تمہاری صورت تو سب سے دیکھی جاتی ہے۔'' اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ دو گھونٹ بھرے اور بولا۔

''سامیہ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم نہ ملیں تو خودکشی کر لوں گا لیکن میری زندگی تمہارے بغیر ایک کربناک المیہ ہوگی۔ یقین کرنا مجھے کبھی کسی لڑکی نے ایسے متاثر نہیں کیا۔''

کپ اس نے تپائی پر رکھ دیا اور خود کھڑے ہو کر سامیہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اس کے انداز میں ایک التجا تھی۔ ایک دُکھ اور ایک کرب تھا۔

''سامیہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں تم نے میرا ساتھ دینا ہے۔''

سامیہ دونوں ہاتھ چھڑا کر اُوپر بھاگ آئی ۔اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مصیبتیں شاید کبھی تنہا نہیں آتیں ۔ بہت سے دُکھوں اور پریشانیوں کے لاؤ لشکر بھی اپنے ہمراہ لاتی ہیں ۔ جب لڑکیاں ماں کی بیماری سے اُلٹی ہوئی پڑی تھیں عافیہ کی پھوپھی اور دونوں لڑکوں کی ہونے والی ساس اچانک ایک دن آ گئی ۔ بھاوج کو دیکھنے اسپتال بھی گئی ۔بستر پر دراز جیسے موت کی دہلیز پر کھڑی عورت کی بے کسی و بے بسی دیکھ کر بھی خدا خوفی اور رحم کی کوئی علامت چہرے پر نہ اُبھری۔

البتہ اس کی زندگی کو بچانے کی تگ و دو میں پریشان اور بھاگ دوڑ کرنے والے لڑکے لڑکیاں اُس کی نظروں میں کسی خار کی طرح کھٹکے۔تھوڑی سی زہریلی گوہر افشانی اُس نے گھر میں کی۔باقی طوفان اپنے گھر جا کر اُٹھایا۔ہونے والے دامادوں کو نہ صرف مطلع کیا بلکہ پورے مرچ مصالحے کے ساتھ تفصیلات بھی گوش گزار کیں ۔ عافیہ کے سسرال بھی اطلاع پہنچ گئی۔

دس دن بعد ضیا ہی ماں کو اسپتال سے لے کر آیا۔

محلے کی چند عورتیں مزاج پُرسی کے لیے آئیں ۔چند ایک بڑی گھاگ شر پسند ٹوہ میں رہنے والی سازشی فطرت کی حامل برسبیل تذکرہ دونوں کرایہ دار لڑکوں کا ذکر چھیڑ بیٹھیں۔ عافیہ نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ بیماری نے اُن کا چہرہ تو پہلے ہی پیلا پھٹک کر رکھا تھا پر اب تو یوں لگتا تھا جیسے رہا سہا خون بھی کشید کر لیا گیا ہو۔

بات تو تھی کہ دونوں کے دفتر کی گاڑی میں ہر روز کوئی نہ کوئی ہسپتال جاتا آتا تھا اب محلے کی عورتیں باتیں کیسے نہ کرتیں ۔اُنکے پاس کونسے دوسرے موضوع تھے باتیں کرنے کے۔

دونوں بیٹے اطلاع ملنے کے باوجود دس دن بعد آئے اور جب آئے تو لگا جیسے اگلے پچھلے جنموں کی تلخیوں کا حساب چکانا چاہتے ہوں۔ وہ زبان دراز کبھی نہیں تھے۔ نہ بدتمیز تھے۔ اونچا بولنے کی بھی اُنہیں عادت نہیں تھی۔ ماں انگشت بدندان تھی۔ وہ موت کے منہ سے بچ کر آئی تھی پر اُنہیں تو رتی برابر پرواہ نہیں دکھتی تھی۔ ہاں اگر پرواہ دکھی تھی کسی بات کی تو وہ بس اتنی سی کہ غیر لڑکے اُن کی جوان بہنوں کو لئے لئے پھرے۔

''ارے ہم مر تو نہیں گئے تھے۔'' ماں نے منہ کھول کر انہیں بتانا چاہا کہ اِس جان لیوا بیماری نے انہیں کیسے پٹخیاں دیں۔ پر وہ تو بات سُننے کے روادار نہ تھے۔ انہیں تو خاندان میں ذلیل ورُسوا ہونے کا غصہ تھا محلے والوں کی فکر تھی وہ کیا کہتے ہوں گے۔

آپ کو ایک لمحے کے لیے اپنی عزت و ناموس کا خیال نہیں آیا۔ کیسے آپ اور آپ کی بیٹیوں نے اُسکا جنازہ نکال دیا۔ بھائی کے گھر دوسرا رشتہ بھی چاہتی تھیں۔ انہوں نے وہ بھی نہیں کرنا جس کی آپ بات طے کیے بیٹھی ہیں۔

میں اور سامیہ دونوں باہر بیٹھی یہ سُنتی تھیں۔ سامیہ نے وضاحت اور اپنی مدافعت میں بولنے کے لیے اندر جانا چاہا پر میں نے اُسے روک دیا مجھے محسوس ہوا تھا ان کی سوچیں اُن کی باتیں اُن کی اپنی نہیں کہیں سے گروی لے کر آئے ہیں۔

ہمارا آنسوؤں پر بس تھا۔ سو وہ ہم نے فراخدلی سے بہائے۔ دونوں صرف ایک دن ٹھہرے اور اگلے دن گاڑیوں پر چڑھ گئے اور جانے سے قبل کرایہ داروں کو الٹی میٹم دے گئے کہ فی الفور گھر خالی ہو جانا چاہیے۔

گھر خالی ہو گیا۔ تینوں بہن بھائی چلے گئے۔

کہانی کا یہ موڑ بڑا اُداس کرنے والا اور المیہ رنگ لیے ہوئے تھا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ عرشے پر ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

چلیے عافیہ باجی! اب ذرا نیند سے باتیں کرتے ہیں۔ اِس عمر میں یہ بھی نہ کی جائیں تو ساری بشاشت اور تازگی مفقود ہو جاتی ہے۔

کوئی نو بجے صبح ایدفو پر کروز لنگر انداز ہوا۔ کنارے پر جانے کے لیے راستہ ایک دوسرے کروز میں سے دیا گیا جو آگے کھڑا تھا۔ ایسی ہی شان و شوکت والا۔ جن کے راہداریوں میں کھڑے عملے نے پاس چیک کرنے کے بعد گزارا۔ مصر کی وزارتِ سیاحت نے ہر اہم شہر کے کناروں کو پختہ کر کے ان چھوٹے جہازوں کے کھڑا ہونے کے لیے پختہ جیٹیاں بنا دی تھیں۔ باہر لشکارے مارتے سیاہ لکڑی کے تانگے کھڑے تھے۔ اُونچے اُونچے کرایوں میں کمی بیشی کا عمل زور و شور سے جاری تھا۔ ایدفو اس لحاظ سے بہت شہرت کا حامل ہے کہ اس غیر اہم اور چھوٹے سے شہر نے مصر کے قدیم ترین ٹمپل جو کرنک کے بعد اہم ہے کو محفوظ کر رکھا ہے اور جو ''دیوتا ہورس'' کے نام سے منسوب ہے۔

کوچ بان نے بیٹھنے کے ساتھ ہی پوچھا۔

''انڈیا انڈیا''

''نہیں نہیں۔'' ہم سب اس انداز میں چلائے گویا ہماری دُکھتی رگ کسی نے دبا دی ہو۔ پاکستان پاکستان۔ ساتھ ہی میں نے پنجابی میں کہا۔

''کمبختو انڈیا کے سوا کچھ اور بھی نظر آتا ہے تمہیں۔''

زوردار لہجے میں الحمد اللہ الحمد اللہ کا ورد ہوا۔ کوچ بان محمد تھا۔ پکا مسلمان۔ جس نے پل جھپکتے میں اپنی مسلمانی کا اظہار کھلے ڈلے انداز میں ہاتھوں کو فضا میں لہرا کر کیا۔ امریکہ کو تبرّوں سے نوازا۔ حسنی مبارک کو کوسنوں سے۔ اسامہ بن لادن کے گلے میں گلابوں کے ہار ڈالے۔ افغانستان اور فلسطین کے لیے دعائے خیر کی۔ اللہ اللہ اسلام اسلام کا بول بالا۔

ایدفو چھوٹا سا شہر جیسے بانہیں کھولو تو ایک ہی کلاوے کے دائروں میں آجائے۔

بجے تو صبح کے نو تھے پر بازار اپنی پوری رونقوں کے ساتھ سجا ہوا تھا۔ٹورسٹوں کے پرے تانگے جھولتے تھے تو بازاروں میں دوکانوں کے آگے بیٹھے مصری شیشہ (حقہ) پیتے تھے۔

بالائی مصر کا یہ چھوٹا سا غیر اہم شہر اس لحاظ سے مثالی اہمیت کا حامل ہے کہ اس نے 'ہورس' دیوتا کے نام سے منسوب اس ٹمپل کی بہترین انداز میں حفاظت کی ہے۔ یہ 137 میٹر لمبا اس کا فرنٹ 79 میٹر چوڑا اور اس کا دروازہ 36 میٹر اونچا ہے۔داخلی دروازہ خوبصورت سیاہ سنگِ خارا کے عقابی مجسموں جو ہورس دیوتا کو ظاہر کرتے ہیں سے سجا ہوا ہے۔یہ ٹمپل پلوٹومی III نے شروع کیا۔جس کی تعمیر آخری ملکہ قلوپطرہ ہفتم تک جاری رہی۔ اس کے بڑے ہال کی چھ کالموں پر مشتمل تین قطاریں جو عبادتوں کے مختلف نظاروں سے بھری پڑی ہیں آگے جا کر ایک اور ہپوسٹائل ہال جس کے دروازے دو ایسے کمروں میں لے جاتے ہیں جہاں عبادت کے لیے تیاری کا اہتمام ہوتا ہے۔یہاں سے آگے سیڑھیاں چڑھ کر ہیں جس کے آگے عبادت گاہ جو ابھی بھی اسی آن بان سے کھڑی ہے۔

دیواروں کے خوبصورت سین بہت دلچسپ تاریخی حوالوں کے منہ کھولتے ہیں۔ ٹمپل کی تعمیر کی رسومات دیوتا ہورس کے والد کے قاتلوں پر فتح کی کہانیاں ہورس کی پیدائش کے مناظر سب کا دیکھنے سے تعلق تھا۔

ٹمپل میں دو چیزیں نمایاں تھیں۔اندر داخل ہونے سے قبل میمسی Mammisi کا پورشن ہے جس کا مطلب ہے بچے کی پیدائش کی جگہ۔یہ علامتی طور پر ہورس سے متعلق ہے جہاں اس کی ہر روز پیدائش ہوتی تھی۔یہ مقدس جگہ خیال کی جاتی ہے شیر خوار بچوں کی ماؤں اور اُن سب عورتوں کے لیے جو بے اولاد ہیں اور بچے کی تمنا رکھتی ہیں۔واقعتاً ان

کمروں میں کھدی عورتوں کی تصویریں بچوں کو دودھ پلاتی نظر آتی ہیں۔

دو تین اور چار منزلہ عمارات والا شہر۔ ہر شہر کا ایک اپنا کلچر۔ سادہ سے لوگ چغے پہنے ہوئے۔ عورتیں برقعوں میں ملبوس کہیں چہرے ڈھنپے ہوئے اور کہیں ننگے۔ دو کانیں آلو پیاز ٹماٹروں اور سیبوں مالٹوں کیلوں سے سجی ہوئیں۔

واپسی پر استقبال بڑا وی آئی پی قسم کا تھا۔ Sterlized تولیوں سے ہاتھوں کی صفائی اور لیمن ڈرنک سے تواضع کا مزہ آیا۔ اور چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی اپنے آپ کو اہم سمجھا۔

میں جب اوپر آئی نیل کے خوبصورت کٹاؤ کے مناظر تھے۔ رنگوں کا طلسم تھا۔ کہیں کہیں کوئی ایسی جگہ جہاں دونوں اطراف کے قدرے اونچائی کے سلسلے یہ بتاتے تھے کہ کبھی ان میں زندگی ہوگی۔ ستون دروازے کہیں تنگ سی گلی شاید یہاں کچھ لوگ رہے ہوں۔

تیونس کی لطیفہ خانم جانگیہ پہنے نہا رہی تھی۔ اللہ یہ مسلمان عورت جو گزشتہ شب قرآن کی آیات پر بحث کرتی تھی۔

کہیں کہیں بہت دور تا حد نظر افق کے کناروں سے ملتا ہوا سرمئی اور بادامی رنگ آمیز پھیلا ہوا صحرا پرندوں کی اُڑتی قطاریں۔ پانی کی لہروں پر دھیرے دھیرے حرکت کرتا جیسے بہتا کروز۔

میں گھنٹوں بیٹھی ان مناظر سے آنکھوں کو سینکتی رہی۔ جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے چند بلند و بالا خوبصورت عمارات سے مزین ایک منظر سامنے سے اُبھرا۔ نیل نے بھی اپنی سمت کا رخ بدلا۔ کئی کروز جہازوں کی قطاروں کا لمبا چوڑا سلسلہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں کناروں سے بندھی تھیں۔ کنارے پر بازار بھی سجا تھا اور ٹمپل بھی سامنے ہی تھا۔

سورج کی کرنیں راستہ بناتی تھیں۔ایک چمکتا راستہ پیچھے اور زمین آ گے۔تین جہازوں سے گزرکر باہر آئے۔سیڑھیاں چڑھیں تو ایک جانا پہچانا مانوس منظر سامنے آیا۔ ایک مصری زمین پر بیٹھا ناگ اور بین کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

کہیں پس منظر میں دف اور رباب کی آوازیں تھیں۔ڈوبتی شام کے ساتھ اس اجنبی سرزمین کا یہ منظر کس قدر دل آویز تھا۔

اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ دف کی کھنک دار آواز فضا میں بکھری ہو اور رباب کی سُریلی تانیں کانوں میں رس گھولتی ہوں۔بلا سے مخالف سمت روشنیوں سے جگمگاتا اور مقامی مصنوعات سے سجا بازار بھی دہائیاں دیتا ہو۔آپ تو اِدھر اُدھر جا ہی نہیں سکتے۔

کوئی ایک ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا یہ حصہ سجاوٹ اور مقامی کلچر کے رنگوں سے آراستہ اپنی مثال آپ تھا۔آنکھوں کو لُبھاتا اور تحیّر کو اُجاگر کرتا تھا۔

کرسیوں میزوں سے سجے ریسٹورنٹ جن کی دیواریں دوم کے پھل کی لمبی لٹکتی زنجیروں سے مزین تھیں اس دوم کی شکل ہمارے ہاں کے دیسی خشک انار جیسی تھی۔اور یہ مقامی درخت کا پھل تھا۔چبوترے پر بیٹھے سانولے سلونے سازندے ساز بجاتے تھے۔ شام کے جھٹ پٹے میں اجنبی سرزمین کے اس تاریخی قصبے کی پُرفضا اور تفریحی جگہ پر خاموشی سے بیٹھ کر سازوں سے نکلتی نامانوس سی دھنوں کو سننا کس قدر لطف اندوز تھا۔

مغرب کی ادائیگی جہاں کی وہ بھی کیا خوب جگہ تھی لوہے کے کھڑے اور بیٹھے راڈوں پر وسیع وعریض مستطیل کمرے جنکی چھتیں رنگین ڈیزائن دار اُونی دریوں سے بنی ہوئیں۔دیواریں اور فرش سُرخ قالینوں سے سجے ہوئے۔اطراف میں ڈیڑھ فٹ چوڑے لمبے میٹرس جن کے آگے رکھی چھوٹی تپائیاں جن پر دھرے لمبے پائپوں والے حقے اُن سیاحوں کے منتظر تھے جن کے پُرے اور پرےمپل دیکھتے تھے۔رنگوں کی مار دھاڑ ہوئی پڑی تھی

یہاں۔دعا مانگی اور باہر آئی۔ٹمپل دیکھنے کے لیے دو تین پوڈے ہی ابھی چڑھی تھی کہ بازار نے آواز دے ڈالی۔

چلو ذرا دل خوش کر آؤں خریدنی تو مجھے دھیلے کی شے نہیں تھی۔جونہی اس کی حدود میں داخل ہوئی انڈیا انڈیا کا شور ہوا۔ایک تو کمبخت اس انڈیا نے مار ڈالا۔جدھر دیکھو اسی نام کی آوازیں تعاقب کرتی پھرتی ہیں۔اور جب میں ایک بک شاپ پر کتابیں دیکھتی تھی دوکاندار نے میرے شانوں پر پھیلی خوبصورت کشمیری کڑھت والی اس پشمینے کی چادر کو ہاتھوں سے چھوتے ہوئے بیچنے کی بات کی۔اس درجہ عجیب اور انوکھی سی بات پر بھونچکی سی ہو کر میں نے اس کی صورت دیکھی۔وہ جھلاتے ہوئے پھر بولا۔

''یہ کتابیں لے لو۔''اُس نے مصر پر لکھی گئی دو کتابیں میرے ہاتھوں میں تھمائیں اور یہ مجھے دے دو۔

''ارے پاگل ہو گئے ہو۔تمہیں کیوں دوں۔ننگی ہونا ہے مجھے کیا۔''

میں ہنس دی۔

ساتھ والی دوکان سے وہ فوراً ایک چادر لے آیا۔اب تبادلے پر پھر اصرار ہوا۔میرے انکار پر قیمت پوچھی گئی۔بہر حال کوئی آدھ گھنٹہ اسی چکر بازی میں گزرا۔بمشکل جان چھڑائی۔

ٹمپل دیکھنے کے لیے اُوپر چڑھی۔رات تو تاریک تھی پر روشنیوں کی یلغار نے اس کا تخم مار ڈالا تھا۔کومبو دراصل اسوان اور ایدفو کے درمیان واقع ہے۔یہ پاسیبیــــق کا قدیم ترین شہر پاسیبیــق دیوتا کا گھر جو دراصل کروکوڈائل دیوتا تھا۔جس کی فراعنہ مصر کے دور سے قبل پرستش کی جاتی تھی۔دراصل یہ دو ٹمپلوں پر مشتمل ایک ٹمپل ہے۔دائیں ہاتھ والا سیبق دیوتا جو دراصل دنیا کی تخلیق کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔جبکہ بائیں ہاتھ والا جنگ کا دیوتا

عظیم ہورس سے معنون ہے۔دونوں ٹمپل اس چار دیواری کے اندر واقع ہیں جس کے دروازے دریائے نیل کے پانیوں میں اُترتے ہیں دونوں ٹمپلوں اوران کے ہپو سٹائل ہال جن میں دیو ہیکل کالموں کی قطاریں اُن پر کھدی انسانی تصویریں اوران کے ایکشن سب کہانیاں سناتے تھے۔

میں نے مزے سے یہ سب دیکھا اور سُنا۔مجھے ذرا جلدی نہیں تھی۔

لوگ چلے گئے تھے ایک میں تھی اور دو میرے جیسے اور جنونی تھے۔بہت دیر بعد جب اُتری تو مجھے کروز کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کس نمبر پر کھڑا ہے۔چلو خیر بھاگ دوڑ سے یہ مسلہ حل ہوا پھر میرے لیے سپیشل راستہ لگایا گیا۔مزے سے میں نے ٹھپ ٹھپ کرتے ہوئے اسے طے کیا۔ایک میں داخل ہوئی وہاں سے دوسرے میں اور پھر گرینڈ پرنسس پر قدم دھرا۔

رات ہم پھر عرشے پر تھیں۔کہانی پھر شروع ہوئی۔

شاید اب تک کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اپنی ماں کی اتنی دبو قسم کی فطرت سے مجھے نفرت محسوس ہوئی پر یہ صرف چند لمحوں کے محسوسات تھے۔دراصل ان کی شخصیت اُن کے حالات کی اسیر تھی۔

بچپن ہی میں یتیمی اور لیسری دونوں ذائقوں سے آشنا ہو گئی تھیں۔تیرے میرے جیسے رشتہ داروں کے ہاں پلنے بڑھنے سے شخصیت میں ڈرنا، سچ بات کا اظہار نہ کرسکنا، اندر ہی اندر اُلجھنا اور گھٹنا جیسی عادات پیدا ہوئیں۔

بیاہ کے بعد پڑھے لکھے افسر آدمی اور تیز طرار ساس نندوں کی گرفت میں آئیں۔

گھر تو کوئی بیس دنوں میں خالی ہو گیا۔پر ہماری بے رنگ سی زندگی میں بہت سے اور رنگوں کا اضافہ ہو گیا۔یہ رنگ مایوسیوں نا اُمیدیوں اور رسوائیوں کے تھے۔

مایوسی اور نا اُمیدی تو پہلے بھی تھی پر رسوائی کے دھبوں سے جیسے ہماری پیشانی

سجائی گئی اس کا تو ہمیں وہم وگمان بھی نہ تھا۔امی جان تو گم سم ہوگئی تھیں۔یا اُن کے آنسو تھے یا اُن کی چُپ تھی ۔نہ ہم سے آنسو دیکھے جاتے اور نہ چُپ توڑی جاتی ۔آخر دلا سا دینے کے لیے تھا کیا؟ جھوٹے الفاظ جو ہونٹوں پر آنے سے قبل ہی دم توڑ دیتے ۔

یہ کس قدر اعصاب شکن سے دن تھے ۔ان کے تصور سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ۔وہ باتیں کرتے کرتے رُک گئی تھیں ۔اُن کا لہجہ بھرّ اسا گیا تھا۔

ایک وجود بستر مرگ پر تھا اور چند دوسرے چلتی پھرتی پرچھائیوں کے عکاس تھے ۔روشنی اور ہوا کے سارے روزن بند تھے ۔

پھر ایک دن عجیب سی بات ہوئی ۔انہونی سی ۔انہوں نے کاغذ قلم مانگا۔وہ اُٹھ کر بیٹھیں اور کچھ لکھنے میں مُصروف ہوئیں۔سامیہ میرے پاس کچن میں آئی ۔اس کی آنکھوں میں مچلتے بہت سے سوالات میں نے پڑھے اور دھیرے سے کہا۔

''اپنے بھائی کے منّت طرلے کر رہی ہوں گی کچھ وضاحتیں، کچھ التجائیں، کچھ معافیاں کہ وہ اُن کی بیٹیوں پر رحم کرے اور انہیں قبول کرے ۔

پرتھوڑی دیر بعد مجھے انہوں نے پکارا اور پوچھا۔

''ضیا لوگ جہاں شفٹ ہوئے ہیں کچھ وہاں کا اتہ پتہ معلوم ہے۔'' میں نے حیرت سے لبریز آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''میں معلوم کرتی ہوں شاید مریم کے پاس ہو۔''

ایڈریس میرے پاس تھا۔ضیا کا خط اور ایڈریس دونوں شہناز نے مجھے دیئے تھے۔

ایک سر بند خط انہوں نے مجھے دیا۔تمہارے گھر سے جانے اور ساتھ میں تمہارے ہی گھر کے کسی بچے کو لے جانے کی بھی تاکید کی ۔اب وہ بچہ تم بن گئیں ۔اُنکا چھوٹا سا قہقہہ فضا

میں گونجا۔

ہم دونوں سے حیرت نہیں سنبھالی جا رہی تھی ۔جی چاہا تھا کہ خط کھول کر پڑھوں پر سامیہ نے منع کیا۔

''اگر ہماری ماں کی بے بسی کا اس میں اظہار ہے تو یہ بھی ہمیں رلائے گی ۔اللہ پر چھوڑو سب باتیں ۔''

تو پھر میں نے تمہیں ساتھ لیا اور ضیا سے ملی ۔

یوں وہ عورت جس کا حوصلہ اور دل چڑی کے پوٹے جتنا تھا۔کیسے شیر جیسے کلیجے کی مالک بن گئی ۔وہ گیلی مٹی تھیں پر اس سارے واقعے نے انہیں اگنیس روک(igneous rock)میں بدل دیا تھا۔

شب کی گہری تاریکی میں جب سارا عالم سوتا تھا۔وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتریں ہمارے ساتھ اُس گاڑی میں بیٹھیں جو ضیا نے ملحقہ سڑک پر لا کر کھڑی کی تھی ۔اس کے دوست کے گھر رسم نکاح میں شامل ہوئیں۔پھر ایک عجیب سی خواہش کی بھی تکمیل کہ نکاح نامے پر گواہوں والے خانے میں اپنے دستخط اور یہ تحریر کہ یہ سب میری مرضی سے ہو رہا ہے ۔درج کیا۔ہماری پیشانیوں پر طویل پیار کیا۔آنسو جو ہماری آنکھوں سے پرنالوں کی صورت بہتے تھے ۔پونچھے اور گھائل لہجے میں بولیں ۔

''پونچھ ڈالو انہیں میرے لیے ۔بہت سکون سے مرنے دو مجھے ۔''

تو بس دو تین دن ہی زندہ رہیں اور پھر مر گئیں ۔بیٹوں کی کھٹی کھٹی باتیں اور زہریلے تبصرے سُنے بغیر ۔ان کی لعن طعن اور ملامت بھرے بولوں کی کڑواہٹ کو مزید چکھے بغیر۔

چند لمحوں تک سوگواری کی بوجھل سی فضا میں سانس لینے کے بعد میں نے اُن کی

طرف دیکھتے ہوئے کہانی کے آخری کردار مریم اور یہ کہ وہ اپنے بھائیوں سے بھی ملتی ہیں یا نہیں کے متعلق جاننا چاہا۔

پیسے میں بڑی طاقت ہے۔وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

ہمارا خاندان پاکستان کی ٹاپ بزنس کمیونٹی میں شمار ہوتا ہے۔جن کے تعلقات کا دائرہ بہت اُوپر تک پھیلا ہوا ہے۔اپنے بارے میں ہم کسی حُسنِ ظن کا شکار نہیں۔ایک چھوٹے سے گھر میں حسرت زدہ زندگی تھی ہماری۔یہ یقیناً اُن دعاؤں کا نتیجہ ہے جو ہماری ماں کے دل سے نکلی تھیں اور جنہوں نے ضیا عطا کو پارس بنا دیا کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو وہ سونے کے ڈلے بن جاتی۔

مریم ہماری سب سے چھوٹی دیورانی ہے اور ہماری کسی بھی تقریب میں شرکت کرنا ہمارے رشتہ داروں کے لیے ایک اعزاز اور فخر کی بات ہے۔

تو یہ اُس کہانی کا انجام تھا جو زمانوں سے میرے اندر مصر کی پُراسرار زمین کی طرح گُچھم گُچھا ہوئی پڑی تھی۔جس کے کرداروں کے بارے میں زندگی کی گھما گھمیوں میں اُلجھنے کے باوجود خیال آنے پر کچھ جاننے کا تجسس اور اضطراب بے کل رکھتا تھا۔تو یہ بھید بھیدوں بھری زمین پر کس انداز میں میرے اُوپر کھلا۔

میں حیرت زدہ تھی۔